Regd. L. No.7243
Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1976

اس پرچہ میں

اسلام اور پاکستان کے خلاف

گہری سازش

مودودی صاحب اور جماعت اسلامی
کی چالیس (۴۰) سال کی تاریخ

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون نمبر	بدلِ اشتراک
1½	۸۰۸۰۰	سالانہ
ڈیڑھ روپیہ	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان ...... ۸ روپے غیر ممالک ...... ۲ پونڈ
نمبر ۱۲	دسمبر ۱۹۷۶ء	جلد ۲۹

فہرست

۱۔ لمعات ———————— ۲

۲۔ تفسیر مطالب الفرقان کی دوسری جلد ———————— ۷

۳۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش ———— }
(طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء } ۹
میں پرویز صاحب کا اہم خطاب) }

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ ناظم اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

للہ الحمد کہ طلوعِ اسلام کنونشن اپنی روایتی سادگی و زیبائی کے ساتھ منعقد اور بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔ حالیہ کنونشن سالہائے ماسبق کی کنونشنوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کامیاب رہی۔ اس میں نہ صرف متوسلین تحریکِ طلوعِ اسلام نے پہلے سے زیادہ ذوق و شوق سے حصہ لیا، بلکہ عام پبلک نے بھی بہجوم در ہجوم شرکت کی؛ اور اس منفرد خصوصیت کے ساتھ کہ چار روز پر پھیلے ہوئے متعدد اجتماعات میں کسی گوشے میں سرگوشیاں ہوتا تو ایک طرف کھانسنے تک کی بھی آواز سنائی نہ دی۔ تین تین، چار چار گھنٹوں پر مشتمل خطابات کو اس محویت، جاذبیت اور سکون و سکوت کے ساتھ سنا گیا کہ ——— مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را ——— کا منظر سامنے آ گیا۔ ان اجتماعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بتوفیق ایزدی، قرآنی فکر کی یہ تحریک کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے، حالانکہ ایک طرف اس کی مخالفت کا یہ عالم کہ ان لوگوں نے اس کے خلاف جھوٹے پراپیگنڈہ کو اپنی زندگیوں کا واحد مقصد قرار دے رکھا ہے، اور دوسری طرف اس کی بےسروسامانی کی یہ کیفیت کہ اس میں کسی قسم کی خارجی امداد کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ حق کی آواز ہے جو اپنے زورِ دروں سے ابھرتی چلی جا رہی ہے۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ (۱۴/۲۴) اس شجرِ خوش ثمر کی طرح جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور اس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ قارئین، جو اس اجتماع میں شریک نہیں ہو سکے، کس بےتابی سے اس کی روئداد سننے کے لئے دقتِ انتظار ہیں۔ لیکن ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم ان کی بےتابی تمنا کا مداوا اس اشاعت میں نہیں کر رہے۔ کنونشن کے پہلے دو خطابات (یعنی پرویز صاحب کا استقبالیہ ——— آدم نو کی تخلیق ——— اور محترم محمد اسلام صاحب کا مقالہ ——— ذکر و فکرِ پرویز) ——— طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن حاصلِ کنونشن پرویز صاحب کا وہ خطاب ہے جس میں انہوں نے اسلام اور پاکستان کے خلاف اس گہری سازش کی پردہ کشائی کی ہے جو چالیس سال سے یہاں مصروفِ تخریب ہے۔ یہ خطاب تین تین گھنٹوں کی دو نشستوں میں سامنے آیا اور اس نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ہمیں قارئین کی طرف سے تقاضوں پر تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ اس خطاب کی اشاعت میں تاخیر نہ کی جائے۔ ان کی اس شدتِ آرزو کے پیشِ نظر اس خطاب کو بتمامہ اس اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ خطاب (۲۴) صفحات پر مشتمل ہے ——— یعنی طلوعِ اسلام کی پوری کی پوری ضخامت پر ——— اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے بالاقساط شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ یہ ابتدائی چند صفحات طلوعِ اسلام کی عام ضخامت پر اضافہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ کہ ہم کنونشن کی روئداد پیش نہیں کر سکے۔ کنونشن کے دیگر مقالات اور مجلسِ مذاکرہ میں پیش کردہ مضامین آئندہ اشاعتوں میں شائع ہوتے رہیں گے۔

کنونشن میں دو تحائف ہدیہ سامعین کئے گئے ——— ایک، پرویز صاحب کی تفسیر مطالب الفرقان کی دوسری جلد۔ جن حضرات کے مطالعہ سے اس کی پہلی جلد گذر چکی ہے، وہ متفق اللسان ہیں کہ یہ اپنے انداز کی منفرد تفسیر ہے جس سے قرآن مجید

فی الواقعہ اپنے صحیح مفہوم کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں "مدنیتِ اسلام" کے عنوان سے لکھا ہے کہ: ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے۔ نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

پرویز صاحب کی یہ تفسیر صحیح صحیح اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

دوسرا تحفہ وہ ہے جسے قائدِ اعظمؒ کے صد سالہ جشنِ ولادت کا ماحصل کہنا چاہیئے۔ یہ جشن، ملک کے طول و عرض میں قریب ایک سال سے منایا جا رہا ہے۔ اس میں (ایک ذمہ دار مرکزی وزیر کے بیان کے مطابق) قریب ۲۰ کروڑ روپیہ کے صرفہ سے دفاتر پر دفاتر لکھے گئے، اور دفاتر پر دفاتر الفاظ فضا میں بکھیرے گئے لیکن کیفیت یہ ہے کہ: ؎

کہہ گئے لاکھ ان سے افسانے — پھر بھی کہنے کی بات باقی ہے

یہ سب کچھ لکھنے اور کہنے کے باوجود قائدِ اعظمؒ کے متعلق جو اہم اور بنیادی بات کہنے کی تھی، وہ کسی نے نہیں کہی — یہ فقرہ تو اب زبان زدِ خلائق ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، لیکن جس نے پاکستان حاصل کر کے دیا تھا اس کے متعلق یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس نے کس طرح اسلام کی بنیادوں پر یہ مطالبہ پیش کیا تھا! ہم اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کی صحیح تاریخ، طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کے فائلوں میں محفوظ ہے۔ انہی فائلوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس تحریک کے دوران (بلکہ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی) اسلام، دین، قرآن کے متعلق کیا ارشاد فرمایا تھا۔ ان کے یہ ارشادات طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات پر بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح منتشر ہیں۔ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی نے ایک عرصہ کی محنتِ شاقہ سے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک سلکِ گہربار کی شکل میں پرو دیا، اور ایک نہایت حسین پاکٹ بک (کتابچہ) میں، کنونشن میں پیش کیا۔ ہم بزمِ کراچی کو ان کی بیش بہا پیشکش پر مستحق ہزار مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اس کتابچہ کی (جس کا نام "قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام" ہے) عام اشاعت کی ضرورت ہے تاکہ ہماری نئی نسل کو (بالخصوص) یہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا اور تقسیمِ ہند کی حقیقی وجہ جواز کیا تھی!

(۲)

حقوقِ نسواں کمیٹی

● "اسلام، مساواتِ انسانیہ کی تعلیم دیتا ہے۔"

● "اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں، اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔"

ہم صدیوں سے یہ نعرے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں انہوں نے فلک شگاف حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ آئیے ہم ان کی حقیقت پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

حیوانات میں مساوات اور عدمِ مساوات کا احساس نہیں ہوتا۔ ایک نوع کے حیوانات اپنے میں سے کسی کو اپنے سے بڑا سمجھتے ہیں نہ اپنے آپ کو کسی سے گھٹیا۔ اسی لئے ان میں نہ احساسِ برتری ہوتا ہے نہ احساسِ کمتری۔ ایک ٹٹو، کوتل گھوڑے کو دیکھ کر کبھی شرم سے گردن نہیں جھکا لیتا۔ نہ ہی کوتل گھوڑا اُسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عدمِ مساوات کا احساس انسانی زندگی میں آ کر بیدار ہوتا ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں عدمِ مساوات نہیں ہوتی۔ وہ سب

نوعِ انسان کے افراد ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ صحت وغیرہ کے اعتبار سے مختلف بچوں میں فرق ہوتا ہے لیکن اس سے ان کی انسانی حیثیت پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ وہ سب ایک جیسے انسان ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد ہمارے خود ساختہ معاشرتی اور تمدنی معیار ان میں اس قسم کی عدمِ مساوات پیدا کر دیتے ہیں جس سے وہ گویا ایک نوع کے افراد ہی نہیں رہتے — کوٹھی کے اندر پیدا ہونے والے بچے، اور سرونٹس کوارٹرز (نوکر گھر) میں جنم لینے والے بچے کو کبھی ایک نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ نہ ہی سیّد نسل کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے اور کسی "نورباف" کے بیٹے کو معاشرہ میں ایک جیسا انسان سمجھا جاتا ہے۔ ان میں عدمِ مساوات کا احساس عمر بھر رہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ (مختلف ذرائع سے) یا تو اس احساس کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے یا تھپکیاں دے دے کر سلا دیا جاتا ہے۔ لیکن صورت کوئی بھی ہو، یہ احساس مرتا نہیں۔ ان کے تحت الشعور میں کروٹیں لیتا رہتا ہے اور مختلف نفسیاتی امراض کا موجب بنتا ہے — "بڑوں" کے اندر بھی اور "چھوٹوں" کے اندر بھی — اور انہی سے خود معاشرہ میں مختلف مفاسد پھیلتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ امیر آدمی یا سادات کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے نے کونسا تیر مارا تھا کہ اسے معاشرہ میں اتنے بلند مقام کا مستحق قرار دے دیا جائے اور غریب یا "ادنیٰ ذات" کے ہاں پیدا ہونے والے بچے نے کیا جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اسے پست مقام کا سزاوار ٹھہرایا جائے! پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ کسی بچے کو اس کا اختیار ہی نہیں ہوتا کہ وہ کونسے گھرانے میں پیدا ہوتا ہے؛ لیکن غریب ماں باپ یا "نیچ ذات" کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو اس کی سزا عمر بھر ملتی رہتی ہے۔ سوچئے کہ اس سے بڑا ظلم اور ناانصافی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ یہ ظلم اور ناانصافی اس قدر بدیہی اور شدید ہے، لیکن قیامت بالائے قیامت کہ انسانوں نے اسے ہمیشہ روا رکھا اور اگر کہیں اس کے خلاف ذرا سی حرکت نمودار ہوئی اسے کچلنے کے لئے متحدہ محاذ بنا لیا۔

لیکن قرآن اس ظلم کو کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے آ کر برملا کہا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ہم نے تمام انسانی بچوں کو محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے ایک انسانی بچے اور دوسرے بچے میں کوئی فرق نہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے ان سب کو ایک سطح پر سمجھا جائیگا۔ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے ان سب کے لئے یکساں مواقع اور ذرائع مہیا کئے جائیں گے اور پھر معاشرہ میں ان کی صلاحیتوں اور حسنِ کردار کی بنا پر مدارج کا تعین ہوگا — وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا (۴۶/۱۹) ہر ایک کے مدارج ان کے حسنِ کارکردگی کی نسبت سے۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (۴۹/۱۳) جو حسنِ کردار میں سب سے آگے ہوگا وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔

قرآنِ کریم نے ان اعلانات سے اس ظلم اور ناانصافی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جسے انسانوں کے خود ساختہ معیار ہمیشہ سے روا رکھے چلے آ رہے تھے۔ اس سے ان نفسیاتی امراض کا بھی علاج ہو گیا جو عدمِ مساوات کے احساس سے عام ہو چکے تھے اور وہ سزا بھی ختم ہو گئی جس میں معاشرہ میں پست سطح پر رکھے گئے انسان ناکردہ گناہوں کی پاداش میں ماخوذ چلے آ رہے تھے۔ قرآن کا نوعِ انسان پر یہ بہت بڑا احسان ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ انسانی دنیا میں، پیدائش کے اعتبار سے عدمِ مساوات کا ایک اور میدان بھی شروع سے چلا آ رہا تھا۔ اور وہ تھا لڑکے اور لڑکی یا مرد اور عورت میں عدمِ مساوات۔ اس عدمِ مساوات کا میدان مردوں کا پیدا کردہ تھا۔

اس تفریق کی رو سے لڑکی کے مقابلہ میں لڑکی۔ اور مرد کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت کم تر سمجھی جاتی تھی۔ امیری اور غریبی یا اونچی اور نیچی ذات کی تفریق تو پھر بھی کسی نہ کسی طریق سے، بالکلیہ نہیں تو کسی نہ کسی حد تک مٹائی جا سکتی تھی لیکن مرد اور عورت کی یہ تفریق کسی صورت میں مٹ ہی نہیں سکتی۔ اس کی روشنی میں دیکھئے کہ صورتِ حال کیا سامنے آتی ہے۔

(۱) مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور انسان ہونے کی جہت سے ان میں عدمِ مساوات کا احساس یکساں ہوتا ہے۔

(۲) عورت اپنے اختیار و ارادہ سے عورت نہیں پیدا ہوتی۔ ایسا فطرت کے پروگرام کی رو سے ہوتا ہے۔

(۳) لیکن اسے اس ناکردہ گناہ کی سزا عمر بھر بھگتنی پڑتی ہے، اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ لاکھ جتن کرنے کے باوجود، وہ عورت کی عورت ہی رہے گی۔

سوچئے کہ کیا یہ ظلم اقوی اور ظلم سے کہیں زیادہ شدید اور ناقابلِ برداشت نہیں؟ قرآن کریم نے آ کر اس ظلم کو بھی مٹایا۔ اس نے جب کہا کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ تو یہ مردوں تک محدود نہیں تھا۔ اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ اس نے جب کہا کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ یا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ تو ان کا اطلاق بھی مردوں اور عورتوں دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ ان دونوں میں طبعی ——— ([illegible]) تفاوت تو ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ فطرت کے پروگرام کے لئے لابدیک ہے۔ لیکن اس طبعی تفاوت کی وجہ سے ان کے مقامِ انسانیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ قرآن کریم، سفرِ حیات کے ہر گوشے میں مرد اور عورت کو دوش بدوش رکھتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اس نے مومنین اور مومنات میں کوئی فرق کیا ہو۔ ان کی مساوات کی شہادات، سارے قرآن میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

ازاں بعد، جب ہم نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا اور ملوکیت، اُمت پر مسلط ہو گئی تو پیدائشی عدمِ مساوات کی ہر شق پھر سے زندہ ہو گئی۔ ہم اس وقت صرف مرد اور عورت کی عدمِ مساوات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دورِ ملوکیت میں معاشرہ میں لونڈیوں کی بھرمار تھی اس لئے مرد کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت لونڈی کی سی رہ گئی۔ اس کے لئے پہلے کچھ روایات وضع کی گئیں اور پھر انہی روایات کی بنیادوں پر فقہی قوانین مرتب ہوئے جو آج تک "احکامِ شریعت" کے نام سے متعارف اور رائج چلے آ رہے ہیں۔ ازدواجی زندگی سے متعلق بات نکاح سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی رو سے نکاح، ایک عاقل۔ بالغ۔ مرد اور عورت کے باہمی معاہدہ کا نام ہے جو فریقین کی کامل رضامندی اور پسندیدگی کی رو سے طے پاتا ہے۔ لیکن ان "احکامِ شریعت" کی رو سے ایک نابالغ لڑکی کا باپ یا دادی، جہاں جی چاہے اس کا نکاح کر سکتا ہے۔ اور اس کا شوہر اس کی کم سنی میں اس کے ساتھ جنسی اختلاط بھی کر سکتا ہے۔ گھر میں مرد حاکم یا داروغہ ہوتا ہے اور بیوی محکوم یا لونڈی۔ مرد کا جب جی چاہے ایک، دو، تین، چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے اور۔ جس وقت جی چاہے، ایک، دو، تین کہہ کر، معاہدہ نکاح کو کالعدم قرار دے سکتا ہے۔ اس طرح تین بار طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ دینے کے بعد، اگر وہ اپنی اس جلد بازی پر نادم ہو اور بیوی کو بیوی بنا کر رکھنا چاہے، تو وہ اسی صورت میں ایسا کر سکتا ہے جب وہ عورت، ایک رات کے لئے ہی سہی، کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ مرد اس سے شب باشی بھی کرے۔ خاوند بیوی کو مار پیٹ بھی سکتا ہے۔ اگر شرک کا خدشہ لاحق نہ ہوتا تو بیوی سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے

خاوند کو سجدہ کیا کرے۔ کیونکہ وہ "مجازی خدا" ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ حیثیت جو عورت کو مرد کے مقابلہ میں، از روئے "احکامِ شریعت" دی گئی ہے۔ اور اس کے باوجود ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ "اسلام" نے جو حقوق عورت کو دیئے ہیں ان کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ دنیا ہمارے اس دعویٰ کا جس قدر مذاق اڑاتی ہے وہ ظاہر ہے۔

۱۹۶۱ء میں مروجہ عائلی قوانین میں ذرا سی اصلاح کی گئی تو مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا گیا۔ وہ اصلاح کیا تھی؟ صرف اس قدر کہ (۱) نابالغ کا نکاح نہیں ہو سکتا: (۲) دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ (۳) طلاق سے پیشتر ثالثی بورڈ کی وساطت سے میاں بیوی میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہیئے اور (۴) مرد، حقِ طلاق عورت کو تفویض کر سکتا ہے۔ یہ تھیں وہ اصلاحات جن کے خلاف قیامت برپا کر دی گئی تھی۔

اب حکومت کی طرف سے ایک "حقوقِ نسواں کمیٹی" متعین کی گئی ہے جس نے کچھ سفارشات مرتب کی ہیں۔ ان سفارشات میں ایک یہ بھی ہے کہ جب معاہدہ نکاح کے استوار کرنے کے لئے مرد اور عورت دونوں کی رضامندی ضروری ہے تو اس معاہدہ کو فسخ کرنے (طلاق) کے لئے بھی مرد اور عورت کو یکساں حق حاصل ہونا چاہیئے۔ یہ سفارش قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کے خلاف کہرام مچایا جا رہا ہے اور پروپیگنڈہ کے ذریعے حکومت پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اس سفارش کو قبول نہ کرے! اور آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لئے دلیل کیا دی جا رہی ہے؟ نہایں معلوم تو سن لیجئے۔ اس مخالفت میں، حسبِ معمول، جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے۔ اس کے آرگن "ترجمان القرآن" کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۶ء میں اس موضوع پر بحث کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے۔

> یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ستمبر ۱۹۷۶ء کا طلوعِ اسلام نظر سے گذرا جس میں اس کمیٹی کی سفارشات کو سراہا گیا ہے ...... اس تحسین و آفرین کے بعد یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہ رپورٹ کس طرزِ فکر اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور کن لوگوں کو خوش کر سکتی ہے۔
> (ص ۹۱)

یہ ہے وہ دلیل جس کی بنا پر کمیٹی کی یہ رپورٹ جہنم رسید کر دینے کے قابل قرار دی جا رہی ہے! جب تعصب انسان کو اس مقام تک لے جائے تو یہ مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ عدمِ گنجائش کی وجہ سے ہم سرِدست اس سے زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتے۔ لیکن اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ حضرات جو فرماتے ہیں کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو، ہم دو مہینے میں اندر ملک میں احکامِ شریعت نافذ کر دیں گے، تو وہ احکام کس قسم کے ہوں گے اور ان کی بنیاد کیا ہوگی؟

ضروری اعلان

یکم جنوری ۱۹۷۷ء سے طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ برائے غیر ممالک تین پونڈ ہوگا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

تفسیر مطالب الفرقان کی دوسری جلد بھی

شائع ہوگئی:

اس جلد کے نمایاں عنوانات کی ایک جھلک ملاحظہ فرمایئے:-

(۱) انسان کی پیدائش — نظریۂ ارتقاء۔
(۲) نفسِ انسانی کیا ہے؟
(۳) کیا انسان کی کوئی فطرت ہے؟
(۴) جن و انس کا مفہوم کیا ہے؟
(۵) ابلیس کون ہے؟
(۶) قصۂ آدم — کیا انسان خدا کا خلیفہ ہے؟
(۷) ملائکہ کی کنہ و حقیقت۔
(۸) جنتِ آدم۔
(۹) عورت کا مقام۔
(۱۰) داستانِ بنی اسرائیل — (قوموں کا عروج و زوال)
(۱۱) شفاعت کا عقیدہ۔
(۱۲) سمندر کیسے پھٹا تھا!
(۱۳) یہودیوں کے بندر بن جانے کا مفہوم۔
(۱۴) ذبح گائے — مردہ کا زندہ ہونا!
(۱۵) غلام اور لونڈیاں۔
(۱۶) ہمارے علماء کی حالت۔
(۱۷) آنے والے کا عقیدہ — (مجدد - مہدی نزولِ مسیحؑ)
(۱۸) ہاروت و ماروت کا افسانہ۔
(۱۹) جادو کی حقیقت — تصوف اور اسلام۔
(۲۰) ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔

ضخامت پونے پانچ سو صفحات

یہ، اور اسی قسم کے دیگر سینکڑوں موضوعات پر سیر حاصل بحث۔

عمدہ سفید کاغذ — آفسٹ کی طباعت — خوبصورت، مضبوط، طلائی جلد

قیمت پچاس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(مطالب الفرقان، جلد اوّل - قیمت چالیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

۱- ادارہ طلوعِ اسلام گلبرگ ۲ لاہور - ۲- مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

قائدِ اعظمؒ کے متعلق

اور تو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن یہ بہت کم بتایا جائے گا کہ انہوں نے اسلام، قرآن اور اسلامی مملکت کے متعلق کیا فرمایا تھا۔ ان کے یہ ارشادات، ایک پاکٹ سائز بک لٹ۔

قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام

میں نہایت حسن و خوبی سے جمع اور مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کا بیش بہا ذخیرہ آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔ قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

اسبابِ زوالِ امّت

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے تھے لیکن کچھ عرصے سے نایاب تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن حال ہی شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اس اہم اور بنیادی سوال کا نہایت حقیقت کشا جواب ملے گا کہ

"ہم ذلیل کیوں ہوئے"

جلدی منگوا لیجئے کیونکہ اس کے ایڈیشن جلدی ختم ہو جایا کرتے ہیں۔

قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

۱۔ ادارۂ طلوعِ اسلام گلبرگ ۲ لاہور —— ۲۔ مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

باسمہ تعالیٰ

اسلام اور پاکستان کے خلاف
گہری سازش

مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کی چالیس (۴۰) سال کی تاریخ
خود مودودی صاحب کے الفاظ میں

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں

پرویز صاحب کا خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام اور پاکستان کے خلاف
گہری سازش

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

عزیزانِ گرامی قدر۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میرے اس خطاب کا موضوع ہے، اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش۔ سازش کے لفظ سے ذہن کسی ایسے انقلاب کی طرف منتقل ہوتا ہے جس کا مقصد کسی حکومت کا تختہ اُلٹنا ہو — خواہ وہ انقلاب ملک کے اندرونی خلفشار کے ذریعے برپا کیا جائے اور خواہ کسی بیرونی طاقت کے ایما یا بل بوتے پر۔ لیکن جس سازش کا انکشاف میرے اس خطاب کا مقصود ہے، وہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا مقصد کسی حکومت کا تختہ اُلٹنا نہیں۔ اس سے مقصود یا تو مملکتِ پاکستان کا سرے سے وجود ہی ختم کر دینا ہے اور یا اُس غرض و غایت کا ختم کر دینا جس کے لئے اس مملکت کا قیام عمل میں آیا تھا اور جو اس کے وجود اور بقا کی اصل و اساس اور وجہ جواز ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی انقلاب کا مقصد، برسرِ اقتدار حکومت کا تختہ اُلٹنا ہو تو اس سے مملکت بہرحال قائم رہتی ہے، صرف حکومت تبدیل ہوتی ہے۔ لیکن جس سازش کا مقصد خود مملکت کا وجود ختم کر دینا ہو — خواہ وہ بیک جست ہو یا بتدریج — اس سے بڑھ کر خطرناک سازش کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس سے آپ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اصل موضوع تک آنے سے پہلے، میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اُن خوش بخت

افراد میں سے ہوں جو فطری طور پر سنہ ۱۹۳۰ء کے پاکستانی ہیں۔ جب علامہ اقبالؒ (علیہ الرحمۃ) نے الٰہ آباد کے مقام پر، مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس مملکت کی غرض و غایت کو انہوں نے چار لفظوں میں، اس اختصار۔ اور جامعیت کے ساتھ سمٹا دیا تھا جو اقبالؒ ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ :۔

> اس سے اسلام کو موقعہ مل جائے گا کہ وہ اُن اثرات و نقوش سے آزاد ہو کر، جنہیں عربی شہنشاہیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے ، اپنے قوانین، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو متحرک کر کے انہیں ایک طرف ان کی حقیقی اور اصلی روح سے قریب تر لے آئے اور دوسری طرف، عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دے۔

میں اپنے اِس خطاب میں اِس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ :۔

(۱) اسلام کی حقیقی اور اصلی روح سے مفہوم کیا ہے ؟

(۲) عربی شہنشاہیت نے (یعنی مسلمانوں کی ملوکیت نے، خواہ وہ عرب ممالک کی ہو اور خواہ وہ غیر عرب ممالک کی) اس روح کو مسخ کر کے اِسے کس طرح مروجہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔

(۳) اقبالؒ نے اس حقیقی اور منزّہ اسلام کے احیاء کی کیا صورت تجویز کی اور وہ کس طرح پاکستان کے لئے ایک خطۂ زمین کی شکل میں عمل میں آئی ——— اور

(۴) اس مقصد اور غایت کو تباہ کرنے کے لئے کونسی سازش کی گئی، اور کی جا رہی ہے۔

اپنے اُسی خطبہ میں، انہوں نے اس امر کی وضاحت بھی کر دی تھی کہ :۔

> اسلام، نہ تو (خدا اور بندے کے مابین) کسی نجی معاملہ کا نام ہے اور نہ ہی یہ کوئی کلیسائی نظام ہے (جس کی بنیاد تھیاکریسی پر ہوتی ہے)۔ یہ ایک ایسی مملکت (سٹیٹ) کا نام ہے جس کا اظہار، روسو سے بھی بہت پہلے، ایک ایسی شکل میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کی پابند تھی اور جس کی بنیاد ایک اخلاقی نصب العین پر تھی۔ (خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

علامہ اقبالؒ کی طرف سے پیش کردہ اسلام کا یہ تصوّر، درحقیقت قرآنِ کریم ہی کی مختلف آیات کی تفسیر ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ :۔

اسلامی مملکت کی خصوصیات

(۱) انسانی ذہن نے اجتماعی نظام کا جو تصوّر بھی پیش کیا ہے اس میں یہ چیز بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے کہ بعض انسانوں کو حق حاصل ہوتا ہے، یا وہ ایسی پوزیشن اختیار کر لیتے ہیں جس سے انہیں یہ اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے

انسانوں پر حکومت کریں۔ قرآن کریم نے کہا کہ یہ تصور کفر ہے، باطل ہے۔ وجۂ تذلیل انسانیت اور باعث تحقیر آدمیت ہے۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ خواہ وہ اقتدار اعلیٰ یا قوانین وضع کرنے کا اختیار بھی کیوں نہ حاصل کرلے حتیٰ کہ اُسے خواہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے۔ اُسے کسی انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ (۳/۷۹) اقتدار مطلق کی شکل سابقہ ادوار میں ملوکیت کی تھی۔ (جس نے عصر حاضر میں ڈکٹیٹر شپ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے) اور قانون سازی کے حق نے آجکل جمہوریت کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اس اختیار کو مذہبی پیشوائیت اپنے لئے مختص کر لیتی ہے۔ اسے تھیاکریسی سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ سب تصورات غیر اسلامی ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی رُو سے، حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس کی نازل کردہ کتاب میں دیئے گئے اصول و احکام کی اطاعت کرائی جائے۔ یہی کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز ہے۔ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵/۴۴) اس کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی جو لوگ قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی تو کافر ہوتے ہیں۔

(۳) جو لوگ اس اصول کو تسلیم کر لیں انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ انہی مومنین پر مشتمل ایک قوم متشکل ہوتی ہے جسے امتِ مسلمہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ اُمت، امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ اس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوتا ہے نہ سیاسی پارٹیاں۔ نہ حزب اقتدار و حزب اختلاف کا وجود ہوتا ہے، نہ گروہ بندانہ تصورات و مفادات۔ ایک اُمت، اس کی ایک مملکت، اس مملکت کا ایک ضابطہ قوانین اور اس کی ایک مرکزی اتھارٹی۔ کوئی غیر مسلم اس امت (قوم) کا فرد نہیں ہو سکتا۔ دنیا بھر کے مومن، بلا لحاظ وطن و نسل، اس اُمت کے فرد ہوتے ہیں اور تمام غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ اسے دو قومی نظریہ کہتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔

مملکتِ اسلامیہ کی سب سے پہلی مرکزی اتھارٹی خود رسول اللہؐ تھے۔ اس لئے اُن کی صورت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انہیں یہ مقام کس طرح حاصل ہو گیا۔ وہ مامور من اللہ تھے۔ چونکہ نبوت یا ماموریت من اللہ، حضورؐ کے ساتھ ختم ہو گئی اس لئے آپؐ کے بعد، اس کا انتخاب اُمت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔ (۴۲:۳۸) اور اس کے لئے بنیادی شرط (QUALIFICATION) سیرت و کردار

کی بلندی اور پاکیزگی، اور اہلیت ہوگی۔ (۸۵/۱۳ و ۴۹/۱۳)

(۴) قرآنِ مجید میں کچھ احکام، متعین شکل میں دیئے گئے ہیں اور باقی، اصول یا اقدار کی شکل میں۔ ان اصول و اقدار پر عمل درآمد کے طریق، اُمت کے مشورہ کے مطابق طے پائیں گے۔ انہیں آپ جزئی احکام کہہ لیجئے۔ قرآنی اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان پر عمل درآمد کے طور طریق، مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے جنہیں مملکتِ اسلامیہ متعین کرے گی۔

یہ تھا مملکت کا وہ تصوّر، جسے قرآنِ مجید نے پیش کیا۔ اس کی بنیادی خصوصیت، یا یوں کہیئے کہ اس کے نتائج یا ماحصل کو، علامہ اقبالؒ نے ایک شعر میں سمٹا کر رکھ دیا ہے، جب کہا کہ ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اس میں نہ کوئی حاکم ہوگا نہ محکوم۔ نہ ہی کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہوگا اور نہ ہی ان کے حصول کے لئے کسی انسان کا دستِ نگر۔ ان کا مہیا کرنا، مملکت کا فریضہ ہوگا۔ اس سے انسانی اقتدار کے تصوّر (خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔) اور نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جائے گی۔

یہ تھا اسلام کا وہ نقشہ، جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا اور جس کے مطابق اُمتِ مسلمہ کی سب سے پہلی مملکت قائم ہوئی (حضورؐ کے بعد) اسے خلافتِ راشدہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی قرآنی قوانین و حدود کے مطابق حکومت۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ خلافت، ملوکیت میں بدل گئی، یعنی وہ قرآنی حدود کی پابند نہ رہی۔ میں اس مقام پر یہ بحث نہیں چھیڑنا چاہتا کہ یہ کیسے ہوا اور اس کا ذمہ دار کون تھا۔ میں اسے اپنی کتاب — شاہکارِ رسالتؐ — میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اس کا مطالعہ فرما لیں۔

غیر قرآنی مملکت

اس (غیر قرآنی) نظامِ حکومت میں دین (اسلامی نظام) کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا — یعنی مذہب اور سیاست میں — مذہب سے مفہوم رہ گیا نظری عقائد اور عبادات (نماز۔ روزہ۔ وغیرہ) اور پرسنل لاز (نکاح، طلاق وغیرہ سے متعلق امور)۔ حکومت نے انہیں مذہبی علماء کی تفویض میں دے دیا، اور امورِ مملکت — پبلک لاز — اپنے ہاتھ میں رکھ لئے۔ اس طرح سلاطین اور مذہبی پیشواؤں کے دو الگ الگ دوائرِ اقتدار وجود میں آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری بھی پھر سے زندہ ہو گیا۔ چونکہ اس نظام (دین) کی مرکزی اقتدارٹی باقی نہ رہی، اس لئے ایک طرف مذہبی فرقے پیدا ہو گئے اور دوسری طرف مسلمانوں کی مختلف سلطنتیں وجود میں آ گئیں۔ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ نہ ایک اُمت رہی، نہ ان کا

ایک ضابطہ قوانین۔ نہ ایک مملکت رہی نہ ایک اتحادِ ملّی۔ یہ ہیں وہ نقوش، جو علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "عربی شہنشاہیت" نے اسلام پر ثبت کرتے اور جن کی وجہ سے وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں باقی نہ رہا۔ انہی غیر اسلامی نقوش کو مٹا کر، اسلام کو پھر سے اس کی حقیقی شکل میں دُنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے انہوں نے مملکتِ پاکستان کا تصوّر پیش کیا۔ اسے نظریہ پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ مملکت جس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔

اسلام پر ان غیر اسلامی نقوش کے ثبت کرنے اور انہیں قائم رکھنے کے ذمہ دار یہ تین عناصر ہیں۔ (۱) نظامِ ملوکیت۔ (۲) نظامِ مذہبی پیشوائیت، جس میں اربابِ شریعت (مُلّا) اور اصحابِ طریقت (صوفی) دونوں شامل ہیں۔ اور (۳) نظامِ سرمایہ داری کے علمبردار۔ —— علامہ اقبالؒ کی ساری زندگی ان عناصر کے خلاف جہاد میں بسر ہو گئی۔ ان کا سارا کلام، ان پر تنقید اور ان کی تردید کا آئینہ دار ہے۔ یہ تو ان عناصر کا تجزیہ ہے۔ لیکن اگر سمٹا کر دیکھا جائے تو اقبالؒ کا مشن درحقیقت اُس نظام کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنا تھا جسے دورِ حاضر میں سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو اِس وقت ساری دنیا میں رائج ہے۔ اِس میں مسلم اور غیر مسلم ممالک کی بھی کوئی تخصیص نہیں کی۔ اس نظام میں، حقِ حکومت (یعنی قانون سازی کا اختیار) انسانوں کو حاصل ہوتا ہے (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) اور مذہب کے متعلق کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ جس کے جو جی میں آئے کہے اور جو دل چاہے کرے۔ حکومت اس میں دخل نہیں دیتی، بلکہ اسے "مذہبی آزادی" کہہ کر، مذہب پرست طبقہ کے سر پر اپنا عظیم احسان دھرتی ہے۔ یہی ہے وہ غیر اسلامی نظام جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ کہتا ہے کہ: ؎

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

وہ مُلّا کے اسلام کے متعلق کہتے ہیں: ؎

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود — حدیثِ اُو ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنّار دار است — حرم چوں دَیر بود، او برہمن بود

یعنی اس کا پیش کردہ اسلام، زمانہ قبل از اسلام (جاہلیت کے زمانے کا) اسلام ہے، جب کعبہ ایک بُت خانہ تھا اور اس کے متولی اس کے پجاری۔ وہ اُمّتِ مسلمہ (مسلمان) کے متعلق کہتے ہیں: ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

دوسری جگہ ہے:۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملّا و پیر

وہ مُلّا کو ایک جگہ —— کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد —— کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر کہتے ہیں: ؎

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد
مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب — کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

لیکن علامہ اقبالؒ نے مروّجہ اسلام اور اس کے علمبرداروں کے خلاف منفیانہ تنقید پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے حقیقی اسلام کے احیاء کے سلسلہ میں مثبت نظریات اور تعمیری اقدامات بھی پیش کئے۔ انہیں معلوم تھا کہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک، اسلامی حکومت کسی جگہ اور کسی زمانے میں بھی قائم نہیں ہوئی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگرچہ اِس وقت دنیا میں بکثرت مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہوگی کہ اپنے ہاں قرآنی نظام رائج کر سکے۔

پاکستان کیوں؟

اس بنا پر انہوں نے سوچا کہ ایسا نظام کسی ایسے خطۂ زمین ہی میں رائج ہو سکتا ہے جہاں پہلے سے کوئی نظام رائج نہ ہو۔ یعنی وہاں پہلی بار کوئی مملکت قائم ہو تاکہ اس میں، قرآنی نظام بآسانی رائج کیا جا سکے۔ پاکستان کے خطۂ زمین کا مطالبہ ان کی اسی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ حالات کا ایسا تجزیہ اور قرآنی نظام کے احیاء کے لئے اس قسم کا عملی حل، اقبالؒ جیسا دیدہ ور ہی پیش کر سکتا تھا۔ لیکن کسی ایسے خطۂ زمین کے حصول کے ساتھ ساری مشکل حل نہیں ہو جاتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس خطۂ زمین میں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ بھی ہو تو بھی اس میں مسلمان تو بہرحال بستے ہوں گے۔ یہ مسلمان مختلف فرقوں سے وابستہ ہوں گے جن میں سے ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہوگی۔ لیکن اسلامی مملکت تو اسے کہا جائے گا جس میں تمام مملکت میں ایک ہی ضابطۂ قوانین رائج ہو، جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ یہ تھی اصل دشواری۔ لیکن انہوں نے اس مشکل ترین سوال کو ویسے ہی نہیں چھوڑ دیا۔ وہ "شاعر" نہیں تھے جو تخیلات کی دنیا میں بستے ہیں۔ وہ نرے "مفکر" بھی نہیں تھے جن کی ساری عمر تصورات کی فضاؤں میں بسر ہو جاتی ہے اور عملی دنیا سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تجریدی فکر کے وہ سخت خلاف تھے۔ اِسی بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ:

> اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے ‏‏ بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ حکیم الامت بھی تھے اور مقنن بھی۔ اس لئے انہوں نے اس سوال پر بڑی گہری نظر سے غور و فکر کیا کہ دورِ حاضر میں اسلامی مملکت میں قانون سازی کا اصول اور طریق کیا ہونا چاہیئے۔ اس موضوع پر انہوں نے اپنے معرکہ آرا مجموعۂ خطبات کے چھٹے خطبہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اسے نہایت مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی مملکت کی تشکیل کے راستے میں وہ کونسی مشکل تھی جس کا حل علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر تھا۔ جب حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی تو وہ ایسے افراد پر مشتمل تھی جو ہماری طرح، پہلے سے "مسلمان" نہیں تھے بلکہ پہلے پہل حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ لہٰذا ان میں کوئی باہمی اختلاف نہ تھا۔ نہ ان کے الگ الگ فرقے تھے، نہ جداگانہ فقہیں۔ وہ کتاب اللہ کو ضابطۂ ہدایت مان کر اسلام لائے تھے۔ بنابریں ان سب نے بلا تردد و تامل کتاب اللہ کو اپنی مملکت کا ضابطۂ قوانین قرار دے لیا جس کی عملی تعمیل مملکت

کی مرکزی اتھارٹی (نبی اکرمؐ) کی وساطت سے ہوتی تھی۔ یہ صدرِ اوّل کی بات تھی۔ لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ جس مملکت کی تشکیل کی تجویز زیرِ غور تھی اس میں بسنے والے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں شیعہ اور سُنّی تھے۔

بنیادی دشواری

پھر سُنیوں میں اہلِ حدیث بھی تھے اور اہلِ فقہ بھی۔ اہلِ فقہ بالعموم چار فرقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ لیکن مجوزہ پاکستان میں اکثریت حنفیوں کی تھی، اگرچہ یہ بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ یعنی دیوبندی اور بریلوی۔ ان میں سے ہر فرقہ کی فقہ الگ الگ تھی۔ اہلِ حدیث براہِ راست احادیث ہی کو قانونِ شریعت مانتے ہیں لیکن اہلِ فقہ کا مسلک یہ ہے کہ ان کے ائمہؒ نے قرآن اور حدیث پر غور و فکر کے بعد جو ضابطۂ قوانین شریعت مرتب کیا تھا، وہی اسلامی قانون ہے۔ ان میں سے کوئی فرقہ بھی اپنی فقہ کے سوا کسی ضابطۂ قوانین کو اسلامی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ دشواری علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر اس صورتِ حال کو بجنسہٖ قائم رہنے دیا جائے تو وہ مملکت متشکل ہی نہیں ہو سکتی کیونکہ مملکت کے وجود کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطۂ قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو سکے۔ سیکولر نظام نے تو اس دشواری کا حل یہ سوچ لیا کہ پرسنل لاز ہر فرقہ کے الگ الگ تسلیم کر لئے گئے اور پبلک لاز حکومت کے خود ساختہ قوانین قرار پائے جن کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہو، لیکن اسلامی مملکت میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق نہیں کی جا سکتی، اور دوسرے اس میں خود پبلک لاز کی حیثیت بھی قوانینِ شریعت کی ہوتی ہے۔ عام ملکی قوانین کی سی نہیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا ان حالات میں ایسی اسلامی مملکت قائم کی جا سکتی ہے جس میں ایک ہی ضابطۂ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ ہو سکے۔

قانون سازی کے اصول

یہ تھا وہ سوال، جس کا جواب علامہ اقبالؒ نے اپنے مجموعۂ خطبات کے چھٹے خطبہ میں نہایت شرح و بسط سے دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کیا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس وقت جو قوانین احکامِ شریعت کے نام سے رائج ہیں وہ سب کے سب غیر متبدل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ :-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا

> بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ——— وہ تغیر، جسے قرآن نے، عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع قطع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے۔ یہ اصول وہی ہے، جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

انہوں نے اس حقیقت کو، اس خطبہ کی آخری سطور میں، ان الفاظ میں دہرایا:۔

> زندگی کی روحانی بنیاد، مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامّل اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

اس اصول کو بیان کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ اسلامی ضابطۂ قوانین میں غیر متبدل صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس کی روشنی میں جس قدر قوانین و ضوابط مرتب کئے جائیں گے ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے، اور یہ تبدیلی اسلامی مملکت کرے گی۔ انہوں نے اس نقطہ کی وضاحت کرتے ہوئے اسی خطبہ میں کہا:

> آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی

رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ:۔

> رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات، کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل، میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتی ہے لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد سوال احادیث کی صحیح پوزیشن کا آتا ہے۔ یہ سوال جس قدر اہم ہے، اسی قدر نازک بھی ہے۔

نازک اس لئے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ عقیدت و محبت مسلمان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے (اور ایسا ہونا ہی چاہیئے) اس لئے جس چیز کی نسبت بھی حضورؐ کی طرف کردی جائے، وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی اسے چھوٹے تک بھی — اسی جذبہ کے تحت ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس نظریہ یا مسلک کی تائید میں کوئی حدیث پیش کردی جائے، اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ ہر فرقہ اپنے مسلک کی تائید میں کوئی نہ کوئی حدیث پیش کر دیتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بنا بریں علامہ اقبالؒ کے نزدیک، بنیادی سوال یہ تھا کہ احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

احادیث کی پوزیشن

اس موضوع پر انہوں نے اپنے مذکورہ بالا خطبہ میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ غور سے سنیئے کہ اس باب میں وہ کیا فرماتے ہیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ کچھ کہنے والا نہ منکرِ حدیث ہے نہ منکرِ شانِ رسالتؐ — (ادب اقبالؒ تو عشقِ محمدیؐ میں گداز تھا) وہ اس نازک ترین مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عاداتؔ اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبرؐ کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے، کیونکہ نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کرلیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور

خمیر استعمال کرتا ہے۔ اِس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ اِن احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ یہ صحیح نہیں کم از کم امام مالکؒ اور زہریؒ کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث، موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق، جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

ان تفصیلی مباحث کے بعد انہوں نے کہا کہ اب جو اسلامی مملکت قائم ہو اس میں قانون سازی کی صورت یہ ہونی چاہیئے کہ قرآن کریم کی غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے مملکت جزئی قوانین (BY-LAWS) خود مرتب کرے۔ لیکن انہیں اس کا بھی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوگی کیونکہ جذباتیت کی وجہ سے اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس باب میں انہوں نے کہا کہ:۔

وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت ترکوں کے ـــــ اور جو زود یا بدیر

حسبنا کتاب اللہ

دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقا کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت گہری ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے، بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ یہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حسبنا کتاب اللہ

(ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے)

اقبالؒ نے [illegible] ۱۹۳۰ء میں پیش کیا اور اس کے بعد وہ ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا تقاضا بن کر سامنے آ گیا۔ آغاز میں لوگوں نے اسے ایک فلسفی کے فریبِ تخیل یا ایک شاعر کے حسین خواب سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ لیکن جب بعد میں نظر آیا کہ یہ خواب ایک عملی تعبیر کی شکل اختیار کر رہا ہے تو چاروں طرف سے مخالفت کا ہجوم امنڈ کر آ گیا۔ اس مخالفت میں

اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت

(یعنی تصورِ اقبالؒ کی اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت میں) اگرچہ ہندو اور انگریز پیش پیش تھے، لیکن اس قسم کی مملکت کا قیام دنیا کی کسی قوم کے لئے بھی خوش آئند نہ تھا۔ لہٰذا اس کے قیام کی مخالفت بالواسطہ یا بلاواسطہ ہر گوشے سے ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندو نہیں چاہتا تھا کہ انگریز سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد جس پورے ملک پر وہ اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا اتنا بڑا ٹکڑا اس کے حیطۂ اقتدار سے نکل جائے۔ دوسری طرف انگریزی سیاست کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ہندوستان ایک غیر منقسم ملک رہے۔ اس لئے ان دونوں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت لازمی تھی۔ ان کی مخالفت کی یہ وجوہات بھی ایک حد تک قابلِ فہم تھیں۔ لیکن اس کی بنیادی وجہ کچھ اور تھی، اور وہ یہ کہ دنیا کی کوئی قوم، کوئی مملکت اور کوئی مذہب بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ (ساری دنیا میں نہ سہی) اس کرۂ ارض کے کسی ایک خطہ میں بھی قرآنی نظام قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ اس نظام کے قیام سے نہ ملوکیت باقی رہتی ہے نہ سیکولرازم۔ نہ وطنی قومیت کا وجود باقی رہتا ہے نہ امپیریلزم کا۔ نہ ڈکٹیٹرشپ باقی رہتی ہے نہ مغربی جمہوریت۔ نہ سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے نہ کمیونزم اور اشتراکیت جیسی ازمز۔ نہ مذہبی پیشوائیت باقی رہتی ہے نہ تھیاکریسی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ جب (چودہ سو سال پہلے) ایک خطۂ ارض میں قرآنی نظام قائم ہوا تھا تو جہانِ سیاست اور دنیائے مذہب کے تمام بت کس طرح ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ اسی خطرہ کے پیشِ نظر قریش نے اس نظام کے

قیام کی اس درجہ مخالفت کی۔ اور اس کے بعد جب یہ نظام قائم نہ رہا تو ساری دنیا کی کوشش یہ رہی کہ یہ نظام دوبارہ قائم نہ ہو جائے۔ ہمارے زمانے میں اقوام عالم کا یہ اندیشہ اور بھی زیادہ لرزہ انگیز ہو گیا ہے کیونکہ دنیا نے مختلف قسم کے نظام ہائے سیاست و معیشت کو آزما کر دیکھ لیا ہے کہ وہ انسانی مشکلات کے حل میں کس طرح ناکام ثابت ہو گئے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے "ارمغانِ حجاز" کی اس نظم میں ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے جو میرے نزدیک ان کی قرآنی بصیرت اور سیاسی دُور نگہی کا نچوڑ ہے۔ اس میں منظر یہ پیش کیا گیا ہے کہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ (کابینہ) کا اجلاس ہو رہا ہے جس میں ابلیس کا ہر مشیر، اپنے اپنے دائرۂ کار پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ اس کے نزدیک ان کے نظام، یعنی ابلیسی نظام، کے مستقبل کو خطرہ کس کس گوشے سے ہے۔ کوئی نازی ازم[1] کو خطرہ کا موجب بتاتا ہے، کوئی فاشزم کو۔ کوئی جمہوریت کو، کوئی کمیونزم کو۔ ابلیس ہر ایک کی رپورٹ کو بغور سنتا ہے لیکن ان کی آراء کو مسترد کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان سے کہتا ہے تمہیں میں بتاتا ہوں کہ ابلیسی نظام کے مستقبل کے لئے حقیقی خطرہ کون سا ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

انہوں نے پوچھا کہ پھر اس کا علاج کیا ہے۔ اس نے کہا کہ علاج اس کا بڑا آسان ہے۔ تم اس امت کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ:

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

---

[1] یہ نظم ۲۳-۳-۱۹۳۶ء میں لکھی گئی تھی۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر　　جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں　　ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو، مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ تھا وہ حقیقی خطرہ، جس کی بنا پر ہندو، مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں اس قدر متشدد تھا۔ ہم عزیزانِ من! اسلامی نظام کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ مسجع نظمیں لکھتے ہیں۔ مرصّع مقالات تحریر کرتے ہیں۔ لیکن اس سے کسی قوم کو، کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ یہ سب شاعری ہے۔ لیکن اقبالؒ کی اسکیم میں یہ شاعری حقیقت بن رہی تھی۔ ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہندوستان کے دیوار بدیوار ایک ایسی مملکت قائم ہو گئی جس میں قرآن کا نظام نافذ ہو گیا تو اس کے درخشندہ نتائج اس قدر دلکش اور انسانیت ساز ہوں گے کہ ان کے سامنے ان کے ہاں کا مذہبی اور سیاسی نظام ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکے گا۔ بنابریں وہ مسلمانوں کی الگ مملکت کے اس قدر مخالف نہیں تھے جس قدر وہ مسلمانوں کی ایسی مملکت کے خلاف تھے جس میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو۔

ہندوؤں کی طرف سے مخالفت

اِس ضمن میں، میں ان کے چند ایک چوٹی کے لیڈروں کے خیالات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ انہیں غور سے سنیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ الفاظ فضا میں پھیل تو رہے تھے ہندو لیڈروں کی زبان سے، لیکن یہ درحقیقت ترجمان تھے اس خطرہ کے، جسے دنیا کی تمام بڑی بڑی قومیں یکساں طور پر محسوس کر رہی تھیں کہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں ——— سُنیئے کہ ہندو لیڈر اس باب میں کیا کہتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح حیات (میری کہانی) میں لکھا تھا کہ:-

جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے، اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت، اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ (صفحہ ۱۶۱)

ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے لیڈر، مسٹر گاندھی، جنہیں ہندو ایشور کا اوتار کہا کرتے تھے، بار بار کہتے تھے:-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم! میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی

معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے...... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن مورخہ ۹ر دسمبر ۱۹۴۷ء)

وہ کہا کرتے تھے کہ مذہب کو سیاست کے ساتھ پیوستہ کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیا جاتا ہے اور اسی بنا پر مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اگر مذہب کو اس کے مقام پر رہنے دیا جائے ...... یعنی ایک شخص کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۹ر جون ۱۹۴۷ء)

کانگریس کے ایک اور چوٹی کے لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوانِ اسمبلی میں، جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا کہ:-

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے، اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز ۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء)

جب پاکستان کا تصور زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلنے لگا تو انڈیا کے اہم نیشنلسٹ اخبار — ہندوستان ٹائمز — نے اپنی ۲۴ر نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ:-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ نعرہ عبث ہوگا۔ اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے اجراء کی تمنا

کریں، جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے　گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار راہ نما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

مسلمانوں کے ذمہ دار راہ نماؤں" سے مراد تھی نیشنلسٹ علماء اور کانگریسی مسلمان۔ یہ خیال اور احساس کہ مسلمان دین کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں، اُس وقت ہندوؤں کے دل میں کس قدر گہرا ناسور بن گیا تھا، اس کا اندازہ اِس سے لگائیے کہ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ پر بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اِس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُس نے اِس کے جواب میں کیا کہا تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم نے ایک ملک فتح کر لیا ہے، اس نے کہا یہ تھا کہ :-

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اُس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربے نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا، اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔
>
> (ہندوستانی پارلیمان کی روئیداد)

ہندوؤں نے تقسیمِ ہند کو دل پر پتھر رکھ کر تسلیم تو کر لیا لیکن مملکتِ پاکستان کے خلاف ان کے دل میں عداوت اور مخالفت کے شعلے برابر بھڑکتے رہے اور ان کی طرف سے اس قسم کے اعلانات ہوتے رہے کہ اگر مسلمان، پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا خیال چھوڑ دیں تو ہم ان کی مخالفت نہیں کریں گے۔ مثلاً ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ :-

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامک اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے، تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائیگا۔

ہندو لیڈروں کے ان اعلانات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ وہ سیاسی طور پر بھی

تقسیم ہند کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن ان کی اصل وجۂ مخاصمت یہ تھی کہ مسلمان پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔ اس تصوّر کے ماتحت راجہ مہندر پرتاب نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ:۔

> جب تک، پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا، ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو ساتھ ملا کر، پاکستان کو ختم کر دے۔
>
> (روزنامہ بھارت۔ مورخہ ۱۲؍ دسمبر ۱۹۵۰ء)

ملک گیر سطح پر ہندوؤں نے پاکستان کے خلاف یہ جنگ ۱۹۶۵ء میں چھیڑی اور اس میں شکست کھانے کے بعد وہاں کے وزیرِ دفاع مسٹر چاوّن نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ:۔

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتہ بھر کی نہیں۔ بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۶۷ء)

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت ہندو اور انگریز دونوں کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندوؤں کے خیالات ہم نے اوپر دیکھ لئے۔ جہاں تک انگریز کا تعلق ہے وہ بھی اس تصور کو ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ دنیا کے کسی حصے میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ آج سے بہت پہلے لارڈ کرومر نے کھلم کھلا کہا تھا کہ:۔

> اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔
>
> (ہفتہ وار ایشیا۔ مورخہ ۱۸؍ جولائی ۱۹۶۷ء)

ہندوؤں کا یہ اندیشہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے، کسی قیاس پر مبنی نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا اور پھر وہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک، اسے دہراتے چلے گئے۔ اس ساتھ قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی واشگاف الفاظ میں پکار پکار کر کہتے رہے کہ پاکستان سے مقصود ہی یہ ہے کہ اس میں قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم کی جائے گی۔

قائداعظمؒ کی تصریحات

بلیں عزیزانِ من! اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا چلا آ رہا ہوں کہ میرے خیال میں اسے دُہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس مقام

پہ صرف دو ایک حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ انہوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

> پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔
>
> (تقاریرِ جناح۔ جلد دوم۔ صفحہ ۸۵)

متفرق طور پر تو انہوں نے اِس حقیقت کو بار بار اور مختلف مقامات پر دہرایا لیکن انہوں نے جن جامع الفاظ میں اِسے اگست ۱۹۴۱ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) کے طلباء کے ایک سوال کے جواب میں سمجھا دیا، وہ اِس موضوع پر حرفِ آخر اور قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ:-

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً، نہ کسی بادشاہ کی اطاعت، ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (بحوالہ اورینٹ پریس آف انڈیا)

اِس موضوع پر مجھے اِس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت اِس لئے بھی نہیں کہ خود ہندو لیڈر واضح الفاظ میں اس کا اعتراف اور اعلان کرتے تھے۔ مثلاً یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور راہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:-

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ تمہیں معلوم نہیں تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا وہ خطۂ ارض ہوگا، جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

ہندوؤں نے جب دیکھا کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے تو انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ اس کی روک تھام کا اس کے سوا مؤثر طریقہ کوئی نہیں کہ خود اسلام کے نام پر اس کی مخالفت کی جائے۔ اس کے لئے انہوں نے نیشنلسٹ علماء کو آگے بڑھایا۔ ان میں (بہ استثنائے چند) علمائے دیوبند شامل تھے جن کے سربراہ

نیشنلسٹ علماء

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے دیوبند، ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے مؤید کبھی بھی نہیں تھے۔ وہ متحدہ قومیت اور سیکولر نظام کو عین مطابقِ اسلام سمجھتے تھے۔ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ار اپریل سنہ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں، اسرار احمد آزاد صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس کی جلی سرخیاں یہ تھیں۔

(۱) علمائے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا جنگِ آزادی میں حصہ۔

(۲) یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں سلطنتِ اسلامیہ کے لئے کوشاں رہے۔

اس دعویٰ کے ثبوت میں اس مقالہ میں لکھا تھا:۔

> دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق رکھنے والے علماء نے آزاد ہندوستان کی جو پہلی جلا وطن حکومت کابل میں قائم کی تھی۔ اس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو مقرر کیا تھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد پچاس سال کی مدت میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان کے ماتحت، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

سیکولر جمہوری نظام کا یہی تھا وہ تصور جسے تحریکِ آزادی کی تائید میں نیشنلسٹ علماء پیش کرتے تھے۔ (مثلاً) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ "ایسی جمہوری حکومت، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی۔ سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔" (زمزم۔ مورخہ ۷ر جولائی سنہ۱۹۳۸ء)

جہاں تک ہندوستان کی سیکولر جمہوری حکومت میں مذہبی آزادی کی ضمانت کا تعلق تھا، مولانا مرحوم اس سلسلے میں فرماتے تھے کہ:۔

> کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہبِ اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔

(مولانا کا پمفلٹ۔ متحدہ قومیت اور اسلام۔ ص۶۱)

اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلام بحیثیت دین کے تھا ہی نہیں۔ وہ اسے دیگر مذاہب کی طرح، ایک مذہب ہی سمجھتے تھے اور مذہبی آزادی سے ان کی مراد تھی نماز روزہ، نکاح طلاق کی آزادی۔ اسی بناء پر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

نیشنلسٹ علماء کے ساتھ احرار، سرحد کے خدائی خدمت گار، آزاد انصار وغیرہ جماعتیں بھی تحریک پاکستان کے خلاف متحدہ محاذ میں شریک تھیں۔ لیکن کانگریس کے بے پناہ فنڈز کے باوجود انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے کہ پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد قائدِاعظمؒ نے اسلامی مملکت اور دو قومی نظریہ کے متعلق اس شرح اور بسط سے خیالات کو عام کیا تھا کہ متحدہ قومیت اور سیکولر جمہوری نظام، مسلمانوں کو اپیل ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقام پر ہندوؤں (اور میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ انگریز کو بھی) سوچنا پڑا کہ تحریک پاکستان کی مخالفت کے لئے متبادل انتظام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا شخص ہی موزوں ہو سکتا تھا جس کا ماضی تو کانگرس کے ساتھ وابستہ ہو لیکن وہ نیشنلسٹ علماء کی صف میں شریک نہ ہو، اور اپنے آپ کو وہ اقبالؒ کے نظریات کے مؤید کی حیثیت سے متعارف کرائے۔ قرائن کی شہادت اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات، قیاس کا رُخ اس طرف منتقل کرتے ہیں کہ اس کے لئے اُن کی

مودودی صاحب

نگاہِ انتخاب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب پر پڑی۔ مودودی صاحب چھوٹی عمر میں صحافت کے پیشے سے منسلک ہو گئے تھے۔ چنانچہ خود ان کی اپنی روایت کے مطابق، 1919ء میں، جب "خلافت اور ستیہ گرہ" کی تحریک کا آغاز ہوا، تو انہوں نے اس میں بھی حصہ لیا۔ اُسی زمانے میں انہوں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی۔ مگر ابھی وہ زیرِ طبع تھی کہ ان کے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اُسے ضبط کرا دیا۔ (مولانا مودودی ۔۔۔۔۔ دعاوی اور عمل۔ شائع کردہ۔ سندھ ساگر اکاڈیمی۔ لاہور۔ صٓ۳) اِس کے بعد مودودی صاحب جبل پور (سی۔ پی) کے ایک نیشنلسٹ اخبار "تاج" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اُس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا، پھر روزانہ ہو گیا اور میں تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک میں بھی تھا۔" (ایضاً) اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے متعلق بمبئی کے مشہور کانگریسی اور احراری لیڈر علی بہادر خان کے اخبار "ہلال نو" کے اس اقتباس کو دیکھئے:-

۲۸ برس قبل، جب جبل پور میں، مولانا مودودی کے ایک مقالہ پر تاج کے پرنٹر پبلشر گرفتار ہوئے تو مولانا مودودی جو تاج کے ایڈیٹر

> تھے گرفتاری سے بچنے کے لئے یکایک دہلی روانہ ہو گئے اور ان کے اِس فعل کی وجہ سے راقم الحروف کا مستقبل کچھ سے کچھ ہو گیا۔ جبل پور کے قوم پرست مسلمانوں اور کانگریسی ہندوؤں نے مجھے تاج کی ادارت پیش کی۔ اور مَیں نے قبول کر لی۔ یہاں سے میری صحافت کا دور شروع ہوتا ہے۔ نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس اخبار کو لاوارث چھوڑ کر یکایک جبل پور سے روانہ ہو جاتے، نہ مَیں اس پیشہ میں قدم رکھتا۔ ان کے جیل سے بچنے کے جذبہ نے میری زندگی کو بدل ڈالا۔

(ہلالِ نو۔ بمبئی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء۔ بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص ۱۴)

۱۹۲۴ء میں مودودی صاحب، جمعیت العلمائے ہند کے اخبار "الجمعیتہ" سے وابستہ ہو گئے۔ یہ اخبار نیشنلسٹ علماء کا سب سے مشہور ترجمان تھا۔ وہ ۱۹۲۹ء تک اس اخبار سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد جب اس اخبار کی مالی حالت خراب ہوئی تو وہ حیدر آباد (دکن) چلے گئے جہاں ان کے برادرِ بزرگ، محترم ابوالخیر مودودی صاحب سررشتہ تالیف و ترجمہ سے وابستہ تھے۔ (غالباً) ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی صاحب نے ماہنامہ ترجمان القرآن کی ادارت کا فریضہ سنبھالا۔ وہاں یہ کانگریسی خیالات کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس رسالے میں ایسے مضامین لکھنے شروع کئے جن سے علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی تائید ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں ابھی طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا، اس لئے اگر کسی گوشے سے بھی اسلامی نظریۂ قومیت کی تائید ہوتی تھی تو تحریکِ پاکستان کے حلقوں میں وہ آواز بڑی مقبول ہو جاتی تھی۔ اِس طرح "اقبالی حلقہ" میں مودودی صاحب فکری طور پر متعارف ہوئے۔ یہاں سے ایک ایسے مرحلہ کا آغاز ہوتا ہے جہاں اِس ہیچمیرز کا نام بھی شریکِ داستان ہو جاتا ہے۔ اِس کے لئے میں احباب سے معذرت خواہ ہوں۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

جب نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت شدت تک پہنچ گئی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا آرگن ہو جو ان کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب خدا اور رسولؐ کے ارشادات کی روشنی میں دے۔ اس کے نئے قرعۂ فال اس "دیوانے" کے نام پر پڑا اور قائدِاعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں[1] ماہنامہ طلوعِ اسلام کے اجراء کی تجویز زیرِ غور آئی۔ میں مرکزی حکومتِ ہند کی

---

[1] محترم میاں بشیر احمد (مرحوم) نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے محرک علامہ اقبالؒ تھے۔ حضرت علامہ کے ارشاد کی تعمیل میں پہلے طلوعِ اسلام محترم سید نذیر نیازی صاحب کے زیرِ اہتمام اور زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا۔ لیکن ایک شمارے کے بعد وہ بند ہو گیا تو ۱۹۳۸ء میں اسی نام سے یہ رسالہ جدید اہتمام کے تحت شائع کیا گیا۔

ملازمت سے منسلک تھا اس لئے ضابطہ کی رو سے اس مجلہ پر کسی حیثیت سے میرا نام نہیں آ سکتا تھا، اگرچہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ مجھے قائد اعظمؒ کی خدمت میں شرف باریابی بھی حاصل تھا، اور فکرِ اقبالؒ کے شیدائی اور مبلغ ہونے کی بنا پر تحریک پاکستان کے فروغ کے لئے میری مساعی کا بھی عام چرچا۔ اس زمانے میں تو مجھے ایسا سوچنے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ لیکن جب میں آج اس دور پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ میں اس آگ سے کس طرح بیباکانہ کھیلتا رہا جس کے قریب تک جانے کی بھی ملازمین سرکار جرأت نہیں کرتے تھے۔ میں نے تو کبھی اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا، لیکن پیر علی محمد راشدی صاحب نے اس دور کے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ اُس سلسلہ میں ان کا ایک مبسوط مقالہ، روزنامہ جنگ (کراچی) کی ۸ر نومبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اِس میں انہوں نے لکھا تھا۔

> ۱۹۳۸ء سے لے کر آخر ۱۹۳۹ء تک میں دہلی میں رہا۔ میں اس کمیٹی سے وابستہ تھا (بلکہ اس کا سیکرٹری) تھا جو پاکستان اسکیم بنا رہی تھی۔ آخر ۱۹۳۹ء سے وسط ۱۹۴۰ء میں لاہور میں رہا جہاں وہ تاریخی اجلاس ہوا، جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ یہ سارا عرصہ مجھے یہ ضرورت رہی کہ مسلمان سرکاری افسروں کے تعاون سے پاکستان اسکیم کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کروں اور اگر ہو سکے تو لیگ کے اجلاس کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں ان کی مدد سے فائدہ اٹھاؤں۔ مگر مجھے سارے ہندوستان میں سوائے تین کے اور کوئی بڑے عہدے پر لگا ہوا مسلمان افسر نہیں ملا جو نظریۂ پاکستان کا حامی ہو یا اس نظریہ کو صحیح ثابت کرنے اور اس کو پھیلانے کے کام میں مدد دے سکے۔ یہ تین افسر تھے۔
>
> (۱) مرحوم و مغفور جسٹس شاہ سلیمان - جو اُس وقت فیڈرل کورٹ کے جج تھے۔
>
> (۲) غلام احمد صاحب پرویز، جو اس زمانے میں مرکز کے کسی محکمہ میں ملازم تھے۔ اور
>
> (۳) خواجہ عبدالرحیم صاحب، جو اُس زمانے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔
>
> مجھے کبھی فرصت ملی تو اُس دور کے واقعات تفصیل کے ساتھ لکھوں گا جن سے من حیث الجماعت مسلمان افسروں کی انتہائی سرد مہری کی نشاندہی ہو گی۔

اسی سلسلۂ مضامین کی ایک کڑی ہیں جو ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء کے روزنامہ جنگ (کراچی) میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے چند ایک دانشوروں کے نام لکھے جنہوں نے پاکستان کی اسکیم کی تیاری میں مدد دی تھی۔ (ان میں بھی میرا نام شامل تھا) اور اس کے بعد لکھا:

> ایک بات خاص طور سے نوٹ کرنے کے قابل تھی۔ وہ یہ کہ جن حضرات کے اسمائے گرامی، میں ابھی بتا چکا ہوں، ان کے سوا کسی اور مسلمان سرکاری افسر نے اس زمانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی بلکہ ان میں سے اکثر تو پاکستان کے تخیل کا مضحکہ اڑاتے تھے اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندو ان سے خفا نہ ہو جائے وہ ونڈسر پلیس کے راستے سے (جہاں یہ اسکیم مرتب کی جا رہی تھی) گذرتے ہی نہیں تھے۔

بہرحال، یہ تھے وہ حالات، جن میں، مجلہ طلوعِ اسلام کے اجراء کا قرعہ اس دیوانے کے نام پڑا۔ مودودی صاحب کے مذکورہ بالا مضامین کی وجہ سے ان کے ساتھ میرا تعارف ہی نہیں، مراسم بھی تھے۔ ان کے رسالہ میں میرے مضامین بھی شائع ہوتے تھے اور وہ جب دہلی تشریف لاتے (جو ان کا وطن تھا) تو ان سے اکثر ملاقاتیں بھی رہتیں۔ انہی مراسم کی بنا پر انہوں نے مجھے لکھا کہ حیدرآباد میں ان کی مالی حالت بڑی سقیم ہو چکی ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں طلوعِ اسلام سے وابستہ ہونے کے لئے دہلی آ جانے کی دعوت دوں۔ اسی دوران میں ایک اور واقعہ رونما ہو گیا۔

دارالاسلام ۔ پٹھانکوٹ

علامہ اقبالؒ ایک قرآنی مرکز قائم کرنا چاہتے تھے جس میں دنیائے اسلام کے ممتاز اہلِ علم و تحقیق، مختلف موضوعات پر ریسرچ میں مصروف ہوں، مذاکروں کا اہتمام ہو، خطبات کا انصرام ہو۔ طلباء تعطیلات گزارنے وہاں آئیں اور اس علمی فضا سے بہرہ یاب ہوں۔ ان کے ایک والہانہ عقیدت مند، چوہدری نیاز علی خاں نے (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔) اس مرکز کے لئے، یوں کہئے کہ، ایک جاگیر وقف کر دی۔ اس کا نام دارالاسلام تھا۔ حضرت علامہؒ کا ارادہ خود وہاں منتقل ہو جانے کا تھا لیکن جب اس کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو ان کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ انہوں نے تجویز کیا کہ سردست وہاں کوئی ایسا شخص بٹھا دینا چاہیئے جو اس کے مبادیات کی دیکھ بھال کر سکے۔ پہلے خیال ہوا کہ میں، ملازمت چھوڑ کر، وہاں چلا جاؤں۔ لیکن قائداعظمؒ نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ میرے اور چوہدری صاحب مرحوم کے مشورہ سے طے پایا کہ اس کام کے لئے مودودی صاحب کو بلا لیا جائے۔ انہوں نے (غالباً حضرت علامہؒ کے استصواب سے) مودودی صاحب کو دارالاسلام آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مودودی صاحب ان کی اس دعوت پر دارالاسلام جانے کے لئے حیدرآباد سے

پہلے دہلی آئے۔ میرے ہاں ان کی نشستیں بھی رہیں۔ عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے مودودی صاحب کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک جدید فقہ کی تدوین کریں، اور اسی مقصد کے لئے وہ حیدر آباد سے اِدھر منتقل ہوئے تھے۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن اتنا علم ضرور ہے کہ مودودی صاحب، دہلی سے سیدھے دارالاسلام (پٹھانکوٹ) چلے گئے تھے۔ اور راستے میں حضرت علامہؒ سے ملاقات کے لئے لاہور ٹھہرے بھی نہیں تھے۔ نہ ہی وہ وہاں سے ان کی عیادت کے لئے لاہور آئے تھے (حالانکہ اس زمانے میں علامہؒ یوں کہئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے) اور نہ ہی اپریل ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات کے بعد ان کی تعزیت کے لئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے ان کی وفات پر اپنے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک لفظ تک نہیں لکھا تھا۔۔۔۔۔ ایک جگہ ضمناً یہ کہا تھا کہ اقبالؒ ان کے لئے ایک مادی سہارا تھا، وہ بھی نہ رہا۔ بہرحال اس طرح یہ حیدر آباد سے منتقل ہو کر دارالاسلام پہنچ گئے۔ مجھے اس کا احساس ہے، اور اب جب میں اس پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں، تو اس کوتاہی پر میرا سر ندامت جھک جاتا ہے کہ ہم نے اس وقت مودودی صاحب کے متعلق کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہ سمجھی اور ان کے چند ایک مضامین سے یہ سمجھ لیا کہ وہ فکرِ اقبالؒ کے دلی ہم نوا اور تحریکِ پاکستان کے قلبی مؤید ہیں۔ ان نشستوں میں جو میرے ہاں ہوئی تھیں، مجھے ان میں انانیت کے جراثیم کی جھلک نظر آئی تھی لیکن میں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اِدھر آنے کے بعد انہوں نے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جس میں تحریک پاکستان کے بنیادی اصولوں کی تائید ہوتی تھی۔ (یہ ۱۹۳۷-۳۸ء کی بات ہے۔) اس سے ان کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا، ورنہ اس سے پہلے (کم از کم ان علاقوں میں) انہیں کوئی جانتا تک نہیں تھا۔ بعد میں یہ مضامین ان کی کتاب ۔۔۔۔۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصہ اوّل و دوم ۔۔۔۔۔ میں شائع کر دیئے گئے۔ (حصہ اول اور دوم" کی تخصیص تو خاص طور پر ذہن میں رکھئے کیونکہ اس کے بعد حصہ سوم میں یہ اپنی نقاب اُلٹ کر سامنے آ گئے تھے)۔ واضح رہے کہ تحریکِ پاکستان کے بنیادی اصول دو ہی تھے ۔۔۔۔۔ دو قومی نظریہ، جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمان اپنے دین کی بنیادوں پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ کسی دوسری قوم میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ اور دوسرا اصول یہ کہ اسلام کا احیاء مسلمانوں کی اپنی جداگانہ مملکت ہی میں ممکن ہے۔ ہندوستان کا جمہوری نظام لادینی ہوگا جو ان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب کے مذکورہ بالا مضامین کے چند ایک اقتباسات آپ کے سامنے پیش کر دوں تاکہ اس سے یہ واضح ہو جائے کہ وہ ان اصولوں کی کس شدّومد سے تائید کرتے تھے۔ میرے سامنے اس کتاب کے حصّہ اول اور حصّہ دوم کا چھٹا ایڈیشن ہے جو تقسیم ہند سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ میں ان اقتباسات کو مسلسل مضمون کی شکل میں پیش کر

رہا ہوں۔ لیکن ساتھ کے ساتھ ان کتابوں کے حوالے بھی دیئے جاتا ہوں۔

میں نے حوالے چیک کر لئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب انہیں چیلنج کریں، یا یہ کہیں (جیسا کہ یہ اکثر کہہ دیا کرتے ہیں) کہ یہ اقتباس سیاق و سباق سے الگ کر کے، توڑ مروڑ کر دیا گیا ہے، تو آپ ان سے کہیئے کہ وہ متعلقہ کتاب دکھا دیں۔ کتاب دیکھتے وقت اس کے ایڈیشن کا ضرور خیال رکھیئے۔ کیونکہ ان کے ہاں بالعموم کتاب کے نئے ایڈیشن میں کافی ردّ و بدل کیا ہوتا ہے اور اس کا ذکر نہیں کیا ہوتا کہ اس میں اور سابقہ ایڈیشن میں فرق ہے۔ اس لئے حوالہ کے سلسلے ایڈیشن کا دیکھنا ضروری ہے۔ بہرحال، مودودی صاحب نے، (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول و دوم میں) لکھا:

"پچھلے باب میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اُس انقلاب سے آگاہ کیا تھا جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں۔ ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس نئے آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے تیار کرنا ہے۔ (جلد اول ۔ ص ۱۹)

مودودی صاحب کا پہلا روپ

ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبان سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں اور یہ آوازیں بھی سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر ہی نہیں، تو ہمارا حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ ٹھیک اسی قومیت کی آوازیں اُس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں جب سرکارِ برطانیہ کی غلامی کا ڈنکا ہمارے ملکوں میں بج رہا تھا۔ (جلد اول صفحہ ۲۲-۲۱)

ہندو کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو......

......ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیشِ نظر ہے اس میں مذہبی جماعتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو۔ (جلد اول ص ۲۴) صاف سُن لیجئے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ (جلد اول ۔ ص ۳۲) مسلمانوں کی حیاتِ قومی کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چیز بالکل ناکافی ہے جس کو آجکل سیاسی اصطلاح میں "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" —— (STATE WITHIN STATE) کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی، جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوتِ ضابطہ اور ہیئتِ حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظامِ حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے گا اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔ (جلد اول ۔ ص ۴۱) اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے

ہوئے شاید بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے...... مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا موقعہ، آخری موقعہ، باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی دبی ہوئی ایک چنگاری موجود ہے اور یہی ہمارے لئے آخری شعاع امید ہے۔ (جلد اول صفحہ ۱۳۲) ہندو قوم کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراجیت کا ایک داؤں اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈہ ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے ہندوستان میں صرف ہندوستانی قوم ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا، سراسر ایک لغو تخیل ہے۔ (لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ) مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ (جلد دوم صفحہ ۱۲)

...... (نیشنلسٹ مسلمان) اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپیریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہو جائے تو پرواہ نہیں۔ (جلد دوم صفحہ ۱۹۲) یہاں نظام حکومت کا نشو و ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرز ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے....... حالانکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پہ تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں۔ (جلد دوم صفحہ ۲۰۰) ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائے گا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دیگا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری (جلد دوم صفحہ ۲۰۳)۔ (ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ) واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بس کی گانٹھ ہے۔ (جلد دوم صفحہ ۲۰۵)۔ (ان تصریحات سے) یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور (آزادیٔ ہند کی وطن پرستانہ) تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہماری موت اُس کی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں۔ نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے بلکہ درحقیقت کلّی اختلاف ہے۔ ایسا شدید اختلاف، کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہو سکتے۔ (جلد دوم صفحہ ۱۹) مسلمانوں کو اپنے نام مسلم پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ (جلد دوم۔ صفحہ ۶۳)"

عزیزان من! آپ ان چند اقتباسات پر غور کیجئے۔ اگر میں نے یہ نہ بتایا ہوتا کہ یہ کس شخص کی

تحریریں ہیں تو آپ بلا ادنیٰ تعمق متفقہ طور پر پکار اٹھتے کہ مسلم لیگ کی اسٹیج سے تحریکِ پاکستان کا کوئی بہت بڑا لیڈر تقریر کر رہا ہے۔ جو یہ ثابت کر رہا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی اس حیثیت کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اس خطۂ زمین میں مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت قائم ہو۔ کیونکہ آزادی کا اصلی جوہر حکومتِ خود اختیاری سے متمتع ہونا، اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔" (حصہ دوم۔ صـ۳۲)
آپ غور کیجئے کہ جو شخص اُس زمانے میں مسلسل دو برس تک اس قسم کے مضامین لکھتا چلا جائے اُسے مسلمانوں میں کس طرح مقبولیت حاصل نہ ہو جاتی، اور کون اس سے دھوکا کھا سکتا؟ —— مودودی صاحب نے اس طرح مسلمانوں میں مقبولیت اور شہرت حاصل کر لی۔

باب دوم

(اصلی رُوپ)

اب اس داستان کا ایک اور ورق اُلٹیے اور جو کچھ سامنے آنے والا ہے، حیرت کی نگاہوں سے دیکھئے اور کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سنیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تحریکِ پاکستان اور ہندوستان کی وطنی تحریک کی جنگ انتہائی شدت پر پہنچ رہی تھی، مسلمان، قائداعظمؒ کے زیرِ قیادت ایک مستحکم قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ بھی متعین طور پر پیش کر دیا تھا۔ جس کا مظاہرہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء میں بہانگِ دہل ہو چکا تھا۔ قوم اس مطالبہ کو لے کر پوری یک جہتی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیشنلسٹ علماء اور دوسرے کانگریسی مسلمان لیڈروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں تھا، کہ عین اُس وقت مودودی صاحب نے پلٹا کھایا اور یوں کہیئے کہ اپنے اصلی چہرے کے ساتھ سامنے آ گئے۔ اُنہوں نے اب ایک اور سلسلۂ مضامین شروع کیا جو اُن کے ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۴۱ء اور مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے، اور بعد میں جنہیں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب کا جو ایڈیشن میرے سامنے ہے اس میں اس ایڈیشن کا نمبر یا سنِ اشاعت درج نہیں، البتہ اس پر یہ لکھا ہے کہ وہ آرمی پریس دہلی میں چھپی تھی، اور چونکہ اس میں جماعتِ اسلامی کے اجتماع منعقدہ اگست ۱۹۴۱ء کی روئداد شامل ہے۔ اس لئے اتنا واضح ہے کہ یہ اگست ۱۹۴۱ء کے بعد شائع ہوئی تھی واضح رہے کہ اِس جنگ میں مخالفین کے مقابلے کے لئے ہتھیار ہمارے پاس دو ہی تھے ایک یہ کہ مسلم لیگ، مسلمانوں کی واحد

نمائندہ جماعت ہے جس کے سربراہ قائداعظم محمد علی جناح ہیں اور دوسرا یہ کہ مطالبۂ پاکستان ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ یہ خالص اسلامی تحریک ہے۔ یہی وہ دو ہتھیار تھے جن سے ہم تمام مخالفین کو شکست پر شکست دیتے آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ عین اُس زمانے میں، مودودی صاحب نے اُس شہرت و مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، جو انہوں نے پاکستانی روپ میں پہلے حاصل کر لی تھی، اس تحریک کی مخالفت شروع کی اور بظاہر بڑے ہی مقدس انداز میں شروع کی۔ اِس کے لئے میں، بنیادی طور پر "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش۔ حصہ سوم" کے اُس ایڈیشن سے اقتباسات پیش کر رہا ہوں، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو اقتباسات سامنے لائے جائیں گے، ان کا حوالہ الگ دیا جائے گا۔ پہلے مسلمان قوم کی حیثیت کو لیجئے۔ مسلم لیگ یا قائداعظمؒ کا یہ دعویٰ تھا کہ حصولِ پاکستان، ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم کا مطالبہ ہے۔

مسلمان قوم کی حیثیت

اس مسلمان قوم کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا:۔

یہ انبوہِ عظیم، جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اُن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ ...... ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے، کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۱۳۰)

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے، وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۱۶۶)

اس وجہ سے وہ عظیم الشان تعداد، جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے، اسلامی اغراض کے لئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسے پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۵۶)

اگر آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزارہا قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک... چڑیا ہے۔ (جلد سوم۔ صـ۳۱)

اسلام کو تانبے کے ان سکوں کا خزانہ مطلوب نہیں جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکّہ ان جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے، اس کے نزدیک، زیادہ قیمتی ہے۔

(جلد سوم۔ صـ۱۶۷)

نہایت معصومیت سے کہہ دیا جاتا ہے کہ فرمائیے! پیدائشی مسلمانوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں ایک لفظ بھی غلط ہے؟...... کیا اسلامی نقطۂ نگاہ سے اُن کی ٹھیک یہی حالت نہیں۔ اگر مودودی صاحب نے اُن کے صحیح خط و خال واضح کر دیئے تو اس سے کونسا گناہ لازم آ گیا؟

بجا اور درست! لیکن سوال یہ ہے کہ اُس وقت یہ کچھ کہنے کا موقع کونسا تھا اور اس کی ضرورت کیا؟ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خود مودودی صاحب نے (سیاسی کش مکش کی پہلی دو جلدوں میں) اس بات پر زور دیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان (جیسے بھی وہ تھے) ایک الگ، منفرد قوم کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کی اِس حیثیت کا باقی رکھنا اور مستحکم کرنا ان کے مستقبل کے لئے نہایت ضروری تھا۔ اُس وقت علامہ اقبالؒ کے پیغامات اور قائدِاعظمؒ کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے مسلمان ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ اس کا اعتراف خود مودودی صاحب نے بھی کیا ہے۔ اُن کے اپنے قلم سے جماعتِ اسلامی اور تحریکِ پاکستان کے متعلق روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلم لیگ، کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک زبردست عوامی قوت کی حیثیت سے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں اُبھری۔ وطنی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ مسلمان اس کے فتنے سے بچ گئے اور ان کے اندر یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے امتیازی وجود کو ایک آزاد اور مستقل حیثیت ہونی چاہیئے۔

ہندو، کانگریس اور نیشنلسٹ علماء وغیرہ یہ کہتے تھے کہ مسلمان الگ قوم کی حیثیت نہیں رکھتے ـــ مسلم لیگ نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان الگ منفرد قوم ہیں۔ ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں کو اس سے شکست ہوئی۔ عین اُس وقت مودودی صاحب آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بجا اور درست کہ مسلمان، اسلام

کی بنیاد پر ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں کوئی مسلمان ہے بھی؟ یہاں کوئی مسلمان بستا ہی نہیں۔ اور جب یہ لوگ مسلمان ہی نہیں تو ان کے الگ قومیت کے دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ وہی بات ہے جو کانگریسی لیڈر کہتے تھے؟ چنانچہ مودودی صاحب نے برملا کہہ دیا کہ:

> اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں، ایک بے دینی قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟۔ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ (جلد سوم۔ ص۸)

چلئے۔ قصہ ختم ہوا؛ دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے —— یہ قوم باقی رہے تو کیا اور ہندوؤں میں جذب ہو جائے تو کیا۔ اس سے کچھ فرق ہی نہیں پڑتا!

یہ تو رہا اُن مسلمانوں کے متعلق، جن کی اکثریت کی بنا پر، مطالبۂ پاکستان پیش کیا جاتا تھا۔ اب آئیے ان کی قیادت (LEADERSHIP) کی طرف۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، اس وقت کی سیاسی جنگ میں ہمارا مؤثر ترین ہتھیار یہ تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اور قائداعظمؒ اس کے واحد نمائندہ سربراہ، جو اسلام کے تقاضا کی رو سے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر رہے ہیں۔ اس قیادت کے متعلق مودودی صاحب نے کیا کیا زہر بکھیرا، اسے خود ان سے سنیئے۔ انہوں نے کہا:

مسلم لیگ کی قیادت کے خلاف

> افسوس کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم۔ ص۳۷) ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استاد فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ (جلد سوم۔ ص۷) ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (جلد سوم۔ ص۸۵) ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے

وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ کعبہ کدھر ہے۔ اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دس فی صدی سے زیادہ نمبر لے سکیں گے۔

(جلد سوم ۔ ص[illegible])

اس مقام پر اس نقطہ کو پیشِ نظر رکھیئے کہ اس وقت ایک آئینی جنگ لڑی جا رہی تھی جس میں ہمارا مؤقف یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی مسلمان قوم کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کے لئے ایک خطۂ زمین الگ کر دیا جائے جہاں وہ اپنے نظریات کے مطابق اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ ہندو اور انگریز کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اکثریت کا نہیں۔ اس وقت مسلم لیگ نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا تھا کہ جن مسلمانوں کی طرف سے یہ دعویٰ پیش کیا جا رہا ہے، وہ یا ان کے لیڈر، اسلام کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اس وقت سوال صرف یہ تھا کہ قانون جن لوگوں کو مسلمان تسلیم کرتا ہے، ان کی اکثریت کا مطالبہ کیا ہے۔ اور اس کا خود مودودی صاحب کو بھی اعتراف تھا کہ ہندوستان کے (بقول ان کے) "پیدائشی مسلمانوں" کو قانون، مسلمان تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سیاسی کش مکش، حصہ اوّل میں لکھا تھا کہ "قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریاتِ دین کا منکر نہ ہو......... ہم ایسے شخص کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرارِ اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔" (حصہ اوّل ۔ ص ۶۵) ان حالات میں وہاں "حقیقی مسلمانوں" اور "پیدائشی مسلمانوں" کا سوال لے کر بیٹھ جانا، خواہ مخواہ مسئلہ زیرِ بحث کو الجھا دینا اور ذہنی انتشار پیدا کر دینا نہیں تو اور کیا تھا؟ ــــ پھر یہ بھی سوچیئے کہ اگر باقی مسلمان پیدائشی مسلمان تھے تو مودودی صاحب کونسے آسمان سے نازل ہوئے تھے۔ وہ بھی تو اسی لئے مسلمان کہلاتے، اور تسلیم ہوتے چلے آ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ یاد رہے کہ ایک نبی کو تو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی پہلی دعوت میں کہے کہ صرف وہ مسلم ہے۔ دوسرا کوئی مسلم نہیں۔ غیر از نبی کے لئے اس قسم کی تخصیص کرنا، انتہائی انانیت ہے۔

مودودی صاحب کا اعتراض یہ بھی تھا کہ مسلم لیگی لیڈروں میں سے کسی کو دین کا علم حاصل نہیں، اور ان کے گھروں میں جانماز تک نہیں ملتی ــــ لیکن اس سے پہلے وہ دو تین برس تک نیشنلسٹ علماء کی بھی مخالفت کرتے رہے تھے۔ انہیں دین کا علم مودودی صاحب سے بھی زیادہ حاصل تھا، اور ان کے گھر جانمازوں سے بھی بھرے پڑے تھے۔ ان کی مخالفت اس لئے کی جاتی تھی کہ ان کا سیاسی مسلک اسلام کے خلاف تھا اور مسلم لیگ کا مسلک اسلام کے مطابق تھا ــــ لیکن اب مسلم لیگیوں کی مخالفت اس لئے کی جا رہی تھی کہ ان کے گھروں میں جانماز نہیں

ملتی تھی؟ ؎

جرمِ اُو از سجدۂ تقصیر ما از دانہ‌ ا
نہ باو بچارہ می سازی نہ با ما ساختی؟

مطلب یہ کہ نیشنلسٹ مسلمان بھی باطل پر اور لیگی مسلمان بھی باطل پر — حق پر صرف مودودی صاحب! اللہ تعالیٰ اس قسم کے فریبِ نفس سے ہر ایک کو محفوظ رکھے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ مودودی صاحب، جمہور مسلمانوں میں کیڑے ڈالنے کے بعد، اُن کی قیادت کے پیچھے پڑے اور اس میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہیں کہہ دیا کہ تمہیں اسلام کا نام استعمال کرنے کا بھی حق نہیں۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے تھے:۔

> اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کی کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے .... اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اولاً اسلام کے خلاف ہیں بلکہ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لئے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ (جلد سوم ۔ ص۷۶) .... جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کریں، ہم اُن کا راستہ روکنے نہیں آتے۔ ہمارا مطالبہ اُن سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ (جلد سوم ۔ ص۷۷)

آپ سوچیئے کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو، مسلمان نہ کہا جاتا اور جس اسلام کی بنیادوں پر الگ مملکت کا دعویٰ کیا جاتا تھا اُس کے متعلق سمجھ لیا جاتا کہ وہ اسلام (نہیں) تو کیا اس مسلم لیگی تحریک کی عمارت، بنیادوں سمیت نیچے نہ آگرتی۔ یہ تھے وہ نکات، جو مودودی صاحب نہرو وغیرہ کے کان میں ڈال رہے تھے کہ تم اس بحث میں یہ دلائل پیش کرو۔

مسلم قوم اور اُس کی قیادت کے بعد اب آئیے اس جماعت (یعنی مسلم لیگ) کی طرف جس کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا جا رہا تھا۔ مودودی صاحب فرماتے تھے کہ:۔

مسلم لیگ کی مخالفت

> ان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو، جو از روئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی جماعت کی رکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کر لے اُسے ابتدائی رکن بنا لیتے ہیں۔ پھر ان ہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمہ دار کارکن اور عہدے دار منتخب ہوتے ہیں اور ان ہی کی کثرت رائے سے تمام معاملات سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ (جلد سوم ۔ ص۱۲۹)

آپ غور کیجئے کہ ہندو اور انگریز دونوں کو، چپکے چپکے یہ سمجھایا جاتا تھا کہ جن مسلمانوں کی نمائندگی کے بل بوتے پر مسلم لیگ اور اس کی قیادت یہ مطالبہ پیش کر رہی ہے وہ مسلمان ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ مسلمانوں کے نمائندے کہلا کس طرح سکتے ہیں۔

> نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت، اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے۔ نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔ (جلد سوم۔ صد ۹۲)

اب آیئے قائداعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی جانب۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ۱۹۳۰ء سے لے کر ـــــ جب علامہ اقبالؒ نے پہلے پہل مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا تصوّر پیش کیا ـــــ ۱۹۴۷ء تک، جب یہ مملکت حاصل ہو گئی ـــ (بلکہ اس کے بعد بھی) ہر مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ اس مملکت کا مطالبہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہم اس میں اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ اب دیکھئے کہ مودودی صاحب، اس مطالبہ کی مخالفت کس طرح کر رہے تھے۔ انہوں نے لکھا:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ (جلد سوم۔ صد ۹۳)

مملکتِ پاکستان تو ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی، مسلمانوں کی جو مملکتیں اُس وقت موجود تھیں، وہ ان کے متعلق بھی کہتے تھے کہ:۔

> ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے، جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہوں۔ (جلد سوم۔ صد ۹۲)

غور کیجئے، یہ صاحب اپنے آپ کو حقیقی مسلمان اور باقی سب کو پیدائشی مسلمان قرار دیتے تھے۔ اب آگے چلئے۔ ملک کی تقسیم کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ (جلد سوم۔ صد ۹۴)

اور جس مقصد کے لئے یہ سب کچھ کہا جا رہا تھا، وہ یوں چھلک کر زبان پر آگیا :-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ (جلد سوم ص ۹۴)
>
> یہ آزادئ وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے شعروں میں امپیریلزم کی مخالفت' یہ سب ہمارے لئے، بکری کی بولیاں ہیں۔ (جلد سوم ص ۹۹)

مذکورہ بالا اقتباسات کی رو سے مودودی صاحب نے کہا کہ حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ مسلمانوں کی ایک الگ آزاد مملکت قائم ہو جائے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے تھے کہ اس امر کی مسرت تو اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ کہا جائے کہ اس مملکت میں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ آپ غالباً متعجب ہوں گے کہ جب ۱۹۳۰ء سے برابر یہ پکار ہو رہی تھی کہ ہم جداگانہ مملکت کا مطالبہ ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ اس میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے تو پھر مودودی صاحب یہ اُلجھاؤ کس طرح پیدا کر رہے تھے؟ وہ اس قسم کا اُلجھاؤ ہی پیدا نہیں کر رہے تھے! انہوں نے متعین الفاظ میں کہا تھا کہ :-

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے ..... جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔ (جلد سوم - ۱۳۲ - ۱۳۱)

یہاں ایک ثانیہ کے لئے رکئے! مودودی صاحب نے یہاں دھڑلے سے کہا ہے کہ لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ یہ کچھ فروری، مارچ ۱۹۴۱ء میں کہا گیا تھا۔ یعنی، دوسری باتوں کو چھوڑئیے، مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے ایک سال بعد۔ اُس اجلاس میں، خود قائدِاعظمؒ نے جو خطاب ارشاد فرمایا تھا، وہ چھپا ہوا موجود ہے۔ آپ دیکھئے کہ اُس میں، اِس مطالبہ کی بنیاد کو کس طرح احیائے اسلام کا تقاضا قرار دیا گیا تھا۔

یہاں ایک دلچسپ بات سنئے۔ جنوری ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ مسٹر بھٹو نے کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران مودودی صاحب کی اسی کتاب کے وہ اقتباسات پڑھ کر سنائے جن میں پاکستان کی ——— مخالفت اور قائدِاعظمؒ کی شان میں گستاخیاں کی گئی تھیں تو

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے ایک بیان دیا جس میں کہا کہ :-

اس کتاب کے مضامین ۱۹۳۹-۴۰ء میں لکھے گئے تھے، جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی تحریک کو ایک قومی ریاست کی بجائے اسلامی ریاست کے نصب العین کی طرف موڑ دیا جائے۔ (روزنامہ امروز و مشرق مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۷۰ء)

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، یہ مضامین رسالہ ترجمان القرآن کی فروری و مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے تھے اور پھر سیاسی کشمکش حصہ سوم کی اس جلد میں بھی شامل تھے جو بہرحال اگست ۱۹۴۲ء کے بعد کسی وقت شائع ہوئی تھی۔ لیکن اس بیان میں وہ فرما رہے ہیں کہ یہ مضامین اس وقت کے ہیں جب ہنوز قرار دادِ پاکستان منظور نہیں ہوئی تھی۔ لیکن مودودی صاحب کے اس کھلے ہوئے جھوٹ کی تردید میں ہمیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں خود مودودی صاحب کا بیان ملاحظہ فرمائیے جو روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں وہ کہتے ہیں :-

اس تحریک کے آغاز ہی سے عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمنائیں کا مرکز 'پاکستان' ایک اسلامی مملکت ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ کی جائے گی۔ اسی لئے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا ——— لا الٰہ الا اللہ ——— مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر، خود قائداعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔

ایک طرف ان کے یہ الفاظ سامنے رکھئے اور دوسری طرف وہ الفاظ کہ "لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے" اور ان دونوں بیانات کی روشنی میں ان کے کیریکٹر کے متعلق آپ خود ہی اندازہ فرما لیں۔ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ——— یہیں تک نہیں۔ انہوں نے اپنے اسی خط میں، جس کے ساتھ ان کا مذکورہ صدر بیان (۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء) شائع ہوا ہے، کہا ہے کہ :-

قائداعظمؒ مرحوم کے متعلق، مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی تحریک کے زمانے میں ان کا یہ ارشاد کہ :-

لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں، جو

اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (جلد سوم - ص۳۷)

یہ ہیں وہ بزرگوار جو اپنے آپ "حقیقی مسلمان" اور باقی سب کو پیدائشی مسلمان قرار دیتے ہیں۔ اس مقام پر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) مودودی صاحب کو پنجاب کی طرف آنے کی دعوت دینے کے "جرم" کا میں بھی مرتکب ہوں۔ لیکن، میں کسی حد تک اس حقیقت کو کفارہ کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جب مودودی صاحب نے ان خیالات کا اظہار کیا تو سب سے پہلے میں نے ان کی مخالفت کی اور کھلے الفاظ میں مخالفت کی۔ حالانکہ اس زمانے میں شاید ہی کسی اور نے انہیں پہچانا ہو۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۴۰ء)

اس زمانے میں ان سے کہا گیا کہ چلئے! یہ سب صحیح کہ ہم مسلمانوں میں ہزار نقص ہیں۔ مسلم لیگ اور اس کی قیادت بھی آپ کے نزدیک اسلامی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ لیکن اس وقت جو جنگ ہو رہی ہے اس میں مطالبہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اگر یہ ایک خطۂ زمین مل گیا تو اس میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا امکان تو ہوگا۔ آپ وہاں اسلامی حکومت قائم کر لیجئے گا۔ آپ اس خطۂ زمین کے حاصل کرنے کے راستے میں تو رکاوٹ نہ بنیئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔

> بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ (جلد سوم - ص۱۶۸)

دوسرے مقام پر انہوں نے کہا کہ:

> نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے، وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے۔ نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں۔ نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے۔ نہ اکثریت کی بنیاد پر قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے، اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔ (جلد سوم - ص۱۱۱)

اس کے لئے وہ فرماتے ہوں گے کہ اسلام کو ایک گوشے میں سمٹا دینے کی بجائے صحیح اسلامی خدمت یہ ہے کہ سارے ہندوستان کو دارالاسلام بنا لیا جائے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ صاحب مسلمانوں کے [illegible]

جذبات کو دلفریب مقدس الفاظ کے ذریعے مشتعل کر کے انہیں مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہو جانے کے لئے کس کس انداز سے ورغلا رہے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ:-

> آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے۔ افسوس ہے کہ وہ اسلام کے اِن امکانات سے ناواقف ہیں۔ (جلد سوم ص ۵)

عزیزانِ من! آپ غور کیجئے اس زمانے میں وقت کیسا نازک تھا۔ انگریز اور ہندو اور ان کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کی تمام قوتیں اِس نکتے پر مرکوز تھیں کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم نہ ہونے دی جائے۔ قائدِ اعظمؒ یہ جنگی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اور عین اس وقت یہ صاحب اِس دامِ ہمرنگِ زمین کی شکل میں مسلمانوں میں اس مطالبہ کی مخالفت کے لئے اس قسم کا زہر پھیلا رہے تھے۔ اور اس کے باوجود مسلسل پچیس سال سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ ہم نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔

مودودی صاحب کی اسکیم

مودودی صاحب کی "خدماتِ جلیلہ" کے ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تقسیمِ ہند کی اسکیم خود پیش کی تھی۔ ذرا اِس فریب کی بھی حقیقت سن لیجئے۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تابع ہندوستان میں ایک وفاقی حکومت قائم کرنے کا تصوّر دیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کے مطالبۂ علیحدگی کے جواب میں انگریز اور ہندوؤں کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں علیحدہ حکومت قائم کر کے ہندوستان کے مرکز کے ساتھ اس کا وفاق قائم کر دیا جائے۔ قائدِ اعظمؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور شدت سے مخالفت کی۔ عین اس زمانے میں مودودی صاحب نے بھی تقسیم کے کچھ خاکے پیش کئے۔ اُن میں انتہائی خاکہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی ریاستوں کا علیحدہ وفاق ہو اور ہندو ریاستوں کا جداگانہ وفاق۔ اور پھر ان میں کنفیڈریشن پیدا کر لی جائے۔ جس کی رُو سے دفاع، مواصلات، تجارتی تعلقات کے لئے باہمی تعاون کر لیا جائے۔ بالفاظِ دیگر یہ شعبے مشترک ہوں (جلد دوم ص ۲۱۲-۲۰۸) آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے مطالبہ کے بالمقابل اس قسم کی کنفیڈریسی سے مطلب کیا تھا؟

جماعتِ اسلامی کی تشکیل

اب تک یہ مخالفت انفرادی حیثیت سے کی جا رہی تھی۔ اِس کے بعد اسے اجتماعی شکل دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مسلم لیگ میں تو وہ پہلے ہی کیڑے ڈال چکے تھے۔ اِس کے بعد انہوں نے کہا کہ:-

> اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں، اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد

اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ مبین۔ دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۹۵) انسانیت کو اس خوفناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت کا برسرِکار آنا ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۱۹۷) اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ (جلد سوم۔ صفحہ ۲۰۱)

یعنی ہندوستان کے (بلکہ صفحۂ ارض کے) تمام مسلمان پیدائشی مسلمان —— حقیقی مسلمان صرف مودودی صاحب۔ اور مسلمانوں کی جماعتیں اور پارٹیاں سب جنسِ کاسد۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ صالح افراد مودودی صاحب کی مرکزیت کے گرد جمع ہو کر ایک صالح جماعت کی تشکیل کریں۔ چنانچہ اس جماعت کو اگست ۱۹۴۱ء میں متشکل کر لیا گیا۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ:

اس جماعت میں کوئی شخص اس مفروضے پر شامل نہیں کر لیا جائے گا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا...... جو شخص سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد کلمۂ شہادت کہنے کی جرأت کرے، صرف وہی اس جماعت میں داخل ہو سکتا ہے، خواہ وہ نسلاً غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے یا پیدائشی مسلمان ہو، اور اب پورے فہم و شعور کے ساتھ اپنے سابق ایمان کی تجدید کرے۔

(جلد سوم۔ صفحہ ۲۱۴-۲۱۵)

اس طرح جماعتِ اسلامی وجود میں لائی گئی تاکہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت اجتماعی طور پر کر سکے۔ حالانکہ اس سے پہلے مودودی صاحب اسی کتاب کے حصۂ اوّل میں یہ لکھ چکے تھے کہ:

مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں، بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی، اور گروہ بندی ہے۔ (جلد اول۔ صفحہ ۵۳)

اب یہ تفرقہ پردازی اور گروہ بندی عین مطابقِ اسلام قرار پا گئی کیونکہ اس نے اپنا نام جماعتِ اسلامی رکھ لیا، اور خود مودودی صاحب اس کے امیر بن گئے۔ اس کے بعد مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اجتماعی طور پر شروع کر دی۔ یہ مخالفت بڑے وسیع پیمانے پر شروع کی گئی۔ جوں جوں تحریکِ پاکستان قوت پکڑتی گئی اُن کی طرف سے اس کی مخالفت بھی شدت اختیار کرتی گئی۔

۴۶-۱۹۴۵ء کے الیکشن

تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ۴۶-۱۹۴۵ء کا زمانہ نازک ترین دور تھا۔ قائدِاعظمؒ اپنے اس دعوے پر ڈٹے ہوئے تھے کہ مسلم لیگ، مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور پاکستان کا مطالبہ اس جماعت کا متفقہ مطالبہ ہے۔ انگریز اور ہندو نے ایک اسکیم مرتب کی اور قائدِاعظمؒ سے کہا کہ ہم ملک میں الیکشن کراتے ہیں۔ بات واضح ہو جائے گی کہ آپ کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ اگر الیکشن نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ واقعی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے تو اس کے مطالبہ کو درخورِ اعتنا سمجھ لیا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ الیکشن کس قدر اہمیت رکھتے تھے۔ یہ تحریکِ پاکستان کے لئے فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ چنانچہ کانگریس نے اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر لیگ کی مخالفت میں ملک گیر مہم شروع کر دی اور ادھر مسلم لیگ نے بھی اس معرکہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دی ـــــ عام مسلم لیگی تو ایک طرف، خود قائدِاعظمؒ کی بھی یہ کیفیت تھی کہ ان پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بے حد مخدوش صحت کے باوجود سارے ملک میں دورے کر رہے تھے اور واضح الفاظ میں بتا رہے تھے کہ لیگ کا مطالبہ کیا ہے۔ مثلاً انہوں نے ۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیئر مسلم لیگ کانفرنس، پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:-

> ہمارا مذہب، ہمارا کلچر اور اسلام کے نظریات ہی دراصل آزادی حاصل کرنے کے لئے ہمارے محرکات ہیں۔

انہوں نے فرنٹیئر مسلم اسٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام (مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۴۳ء) میں کہا کہ:-

> پاکستان کا مطلب صرف آزادی نہیں بلکہ اس کا مفہوم اس مسلم آئیڈیالوجی کو محفوظ کرنا ہے جو ایک بیش بہا متاع کی حیثیت سے ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔

قائدِاعظمؒ اور تمام مسلم لیگی رہنما ملک بھر میں ان انتخابات کی اہمیت کا اس طرح چرچا کر رہے تھے۔ انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ:-

> یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم تباہ ہو جائیں گے بلکہ اس برصغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

اس کے برعکس مودودی صاحب اس قسم کے فتوے صادر فرما رہے تھے کہ:۔

جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر بنی ہیں، ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لئے ووٹ دینا بھی حرام ہے۔

(رسائل و مسائل۔ حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۲۵۷)

جب ان سے کہا جاتا کہ بابا! معاملہ ایسا آ پڑا ہے کہ چند ووٹوں کے عوض مسلمانوں کو ایک مملکت حاصل ہو رہی ہے، تو وہ جواب میں کہتے کہ:۔

ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو، اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔

(اخبار کوثر۔ مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء بحوالہ "مولانا مودودی۔ دعاوی اور عمل" صفحہ ۸)

وہ تو یوں کہیئے کہ اس قوم کی خوش بختی تھی کہ اس نے مودودی صاحب کے ان فتووں کا کچھ اثر نہ لیا، ورنہ اگر وہ ان الیکشنوں میں بطور امیدوار کھڑے ہونے اور ووٹ دینے کو شرعاً حرام سمجھ لیتے اور اس طرح مسلم لیگ شکست کھا جاتی تو سوچئے کہ مسلمانوں کا حشر کیا ہوتا؟ الحمد للہ کہ لیگ کو فقید المثال کامیابی حاصل ہوئی اور اسی کامیابی کی بنا پر پاکستان کا مطالبہ منوا لیا گیا۔

جوں جوں پاکستان کی منزل قریب تر آتی گئی مودودی صاحب کی سازش کا نشتر اور گہرائی تک اترتا گیا۔ حکومتِ برطانیہ نے فروری ۱۹۴۷ء میں اعلان کر دیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک اختیارات اہل ہند کی طرف منتقل کر دیئے جائیں گے۔ اس پر یہ سوچا گیا کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے، اور مسلم اکثریت کے صوبے ان کی سازشوں سے متاثر نہیں ہوئے، اس لئے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف اکسانا چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے جماعتِ اسلامی کے وفود نے ان صوبوں کا رخ کیا۔ چنانچہ

اقلیتی صوبوں میں زہر افشانی

انہوں نے اپریل ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ٹانک، مدراس۔ اور پٹنہ میں جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے اور ان میں اس زہر کو بڑے وسیع پیمانے پر پھیلایا۔ ٹانک[1] کے اجلاس میں جو ۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوا تھا، مودودی صاحب سے متعین سوال کیا گیا کہ جب مطالبہ، مسلمانوں کے لئے ایک مملکت حاصل کرنے کا ہے تو پھر کونسا امر مانع ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہ دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ:۔

جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک۔۔۔۔

---

[1] علاقہ میں مسلم لیگ کی تحریک کافی زوروں پر تھی۔

مسلمانوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے، یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے، اگر مسلمان اسلام کے فی الواقعہ سچے نمائندے ہوتے۔ اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک خطہ سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے۔

{ روئداد جماعتِ اسلامی۔ حصہ پنجم۔ شائع کردہ مکتبہ جماعتِ اسلامی۔ ذیلدار پارک۔ اچھرہ لاہور۔ صفحہ ۱۰۵۔ ایڈیشن کا سال نہیں دیا گیا۔ }

آپ نے دیکھا کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کس طرح بہکایا جا رہا تھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اگلا اجلاس ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو مدراس میں ہوا۔ اس میں مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ:-

ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لا کر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے۔ ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لئے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۴)

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (تحریکِ پاکستان کی بجائے اگر مسلمانانِ ہند اس دعوت کو قبول کر لیتے جو وہ دے رہے تھے) :-

...... تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا، اور وہ چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات...... ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ...... (یاد رکھیے) جونہی ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

یہ تقریریں اس قدر اشتعال انگیز اور نتائج کے اعتبار سے ایسی تباہ کن تھیں، کہ مدراس کے مسلم لیگی مسلمانوں نے ان کی جلسہ گاہ پر ہلہ بول دیا اور انہیں سخت ناکامی کی حالت میں اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔

جس زمانے میں اُدھر مدراس میں ان کے اجلاس ہو رہے تھے، اِدھر پٹنہ میں بھی اسی قسم کے جلسے کئے جا رہے تھے۔ اسی زمانے میں ہندوؤں نے ملک گیر فسادات شروع کر رکھے تھے اور مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمان (بالخصوص مسلم لیگی مسلمان) اندوہناک مصائب کا شکار ہو رہے تھے۔ عین اس وقت جماعتِ اسلامی کے

سرگروہ راہنما' امین احسن اصلاحی صاحب' پٹنہ میں مسلمانوں سے فرما رہے تھے کہ:-

آپ کو معلوم ہے کہ جو نازک حالات اس وقت پیدا ہو گئے ہیں، یہ سرسری اور سطحی نہیں بلکہ ان کے اسباب نہایت گہرے ہیں - جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غنڈوں اور بدمعاشوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور دیر یا سویر یہ درست ہو جائیں گے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں - ہمارے نزدیک یہ سارے حالات اس قومیت کی تعلیم کا نتیجہ ہیں جس کو پیدا کرنے کے لئے اس ملک کے لیڈروں نے جدوجہد کی ہے ...... اس وجہ سے آپ کو صرف موجودہ ہنگاموں اور موجودہ فسادات پر ہی غور نہیں کرنا ہے بلکہ آئندہ کے مفاسد پر بھی غور کرنا ہے اور ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے ماتحت آپ کو اس طرح کام کرنا ہے کہ فساد کی جو فصل ہمارے لیڈروں کے ہاتھوں اس ملک میں بوئی گئی ہے، وہ نشو و نما نہ پانے پائے اور اس کے پھلنے اور پکنے سے پہلے لوگوں میں اس کے پس بھرے ہونے کا یقین پیدا ہو جائے۔ (ایضاً صـ۱۴۲)

اسی اجلاس سے ملک نصراللہ خاں صاحب نے بھی خطاب کیا- (ان کی وفات حال ہی میں ہوئی ہے-) انہوں نے کہا کہ:-

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں- حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالم دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے- ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتاً نابلد ہیں اور محض ادھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی اور سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں- یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خدا کے خوف سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بےوقوف بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں- ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعاتِ زمین تاکتے پھریں- اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایک ایسی منضبط اور منظم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریۂ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مر مٹنے والی ہو- اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہو گی وہیں وہ اس نظریے کی حکومت قائم کر لے گی- (ایضاً صـ۱۵۱)

ہندو نے جب بازی ہرتی دیکھی تھی تو اس نے آخری حربہ یہ استعمال کیا تھا کہ مسلم اقلیت کے صوبوں کی طرف سے

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرائی جائے۔ اور یہ تھی وہ جماعت، جو ان کی اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے سلسلہ

مہاتما گاندھی کی شرکت

اس طرح مصروف "جہاد" تھی۔ کیا اس کے بعد بھی یہ سمجھنے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ اس جماعت کا وجود ایک گہری سازش کا رہینِ منت تھا؟ اور اگر کسی کو اب بھی اس میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے تو وہ سُن لے کہ پٹنہ کے اس سیشن میں، اسلامی جماعت کی دعوت پر خود مہاتما گاندھی نے اپنی شام کی پرارتھنا کو ملتوی کر کے شرکت کی تھی۔ اور انہوں نے اصلاحی صاحب کی اس تقریر کو سننے کے بعد فرمایا تھا کہ "میں نے آپ کی تقریر کو بڑے غور سے سنا اور مجھے اسے سُن کر بہت مسرت ہوئی۔" (ایضاً صفحہ ۱۹۱)

معلوم ابھی ان لوگوں کے منصوبے کیا کیا تھے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جلد بازی نے ان پر پانی پھیر دیا۔ اس نے جون ۱۹۴۸ء کے بجائے، جون ۱۹۴۷ء ہی میں تقسیم ہند کا اعلان کر دیا۔ لیکن ان مخالفین کے ترکش میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ انہوں نے وہ تیر بھی یہ کہہ کر چلا دیا کہ سرحد میں ریفرنڈم کرایا جائے کہ وہ صوبہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہے گا یا ہندوستان کے ساتھ۔ یہ مرحلہ پھر بڑا نازک تھا۔ باؤنڈری کمیشن

سرحد کا ریفرنڈم

نے گورداسپور کا ضلع، جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوستان کے ساتھ ملا دیا، تو ہم مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں اس قدر مسلسل مصیبتوں میں الجھ گئے۔ اگر اس ریفرنڈم کے نتیجہ میں صوبۂ سرحد کا الحاق ہندوستان کے ساتھ ہو جاتا تو آپ سوچئے کہ اس کے بعد پاکستان کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا.....؟ اس وقت ایک ایک ووٹ پوری کی پوری مملکت پر بھاری تھا۔ اس کے متعلق مودودی صاحب سے پوچھا گیا تو انہوں نے اسلامی جماعت کو رائے دینے کی تو اجازت دے دی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ:-

> رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں، تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف اُن امور میں پابند کرتی ہے جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔

(رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۲۴۳۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۱ء)

غور فرمائیے کہ ان کے نزدیک صوبۂ سرحد کے ریفرنڈم کا مسئلہ ان امور میں سے تھا ہی نہیں جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہوں۔ للہ الحمد! کہ ان کے اس قسم کے زہر میں بجھے ہوئے نشتروں کے باوجود ـــــ مسلم لیگ کو ریفرنڈم میں کامیابی ہوئی۔

سرحد کے ریفرنڈم کا مسئلہ اس قدر اہم تھا کہ، تشکیلِ پاکستان کے بعد، جماعتِ اسلامی والوں سے جب بھی اس کے متعلق بات کی جاتی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ بالآخر انہوں نے اسی حربہ سے کام لیا جو ان کا مخصوص ہتھیار ہے یعنی سفید جھوٹ۔ چنانچہ اخبار ایشیا نے اپنی ۱۱ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا کہ:-

> جب پاکستان سے الحاق کے لئے ریفرنڈم کا وقت آیا تو جماعتِ اسلامی کی پوری

تنظیم مولانا مودودی کی ہدایت پر پاکستان کے حق میں مصروف جہاد ہو گئی۔
اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ اس وقت پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا۔ عملی تقسیم میں چند دن باقی تھے۔ مودودی صاحب جس شدت سے پاکستان کی مسلسل مخالفت کرتے چلے آ رہے تھے اور یہاں کی مملکت کو کافرانہ نظام سے بھی بدتر لعنت قرار دے رہے تھے، اس کے پیشِ نظر عام اندازہ یہی تھا کہ وہ ہندوستان ہی رہ کر اپنی اس اسکیم پر عمل پیرا ہوں گے جس کی رو سے وہ کہتے تھے کہ سارے ہندوستان کو اسلامی مملکت بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی سازش کا تقاضا کچھ اور تھا ـــ اور وہ یہ کہ اب پاکستان کے اندر بیٹھ کر اس کی تخریب کے لئے کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے ریفرنڈم کے سلسلے میں یہ کہا کہ:۔

> البتہ شخصی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔
> (رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۲۲۳۔ ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۱ء)

عزیزانِ من! مودودی صاحب نے جس طرح اور جس قدر تحریکِ پاکستان کی مسلسل اور متواتر مخالفت کی اس کی تفاصیل آپ کے سامنے آ گئیں۔ ان میں میں نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے نہیں کہا۔ تمام تفصیلات ان کی اپنی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ ایک طرف انہیں دیکھئے اور دوسری طرف ان کا ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے، جس میں انہوں نے کہا ہے:۔

> یہ خیال کرنا کہ جماعتِ اسلامی کا قیام مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے اور تحریکِ پاکستان کے خلاف ایک دوسری تحریک اٹھانے کے لئے کیا گیا تھا، محض ایک بے جا بدگمانی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بدگمانی صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی جبکہ جماعت نے تحریکِ پاکستان کے خلاف کوئی مہم چلائی ہوتی یا کوئی جلسہ کیا ہوتا یا کوئی قرارداد پاس کی ہوتی یا اس کے اجتماعات میں مخالفانہ تقریریں کی ہوتیں۔ لیکن اگست ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک جماعت کی پوری کاروائیوں میں کسی ایسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو بس یہ کہ ہم نے تحریکِ پاکستان میں حصہ نہیں لیا۔۔۔۔۔۔ بہرحال ہم نے جس وقت یہ کام شروع کیا تھا اس وقت بھی اسے برحق سمجھتے تھے اور آج اس سے زیادہ برحق سمجھتے ہیں۔
> (نوائے وقت۔ ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء)

مجھے اس بیان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء تک کی تفاصیل آپ کے سامنے آ چکی ہیں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس کے بعد انہوں نے کس انداز سے اپنی مخالفت جاری رکھی اور اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں، کیونکہ (ان کے الفاظ میں) وہ اس مخالفت کو آج اس سے بھی زیادہ برحق سمجھتے

ہیں، جس قدر برحق تقسیم سے پہلے سمجھتے تھے۔

باب سوم

(تشکیلِ پاکستان کے بعد)

پاکستان وجود میں آگیا اور مودودی صاحب اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت پٹھانکوٹ (بھارت) سے منتقل ہو کر لاہور میں آبراجمان ہوئے۔ یہاں سے ان کی سازشوں کی داستان کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ہندوؤں نے تقسیم ہند کو طوعاً و کرہاً مان لیا تھا لیکن انہوں نے دل سے اسے قطعاً تسلیم نہیں کیا تھا۔ اندازہ لگائیے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، تقسیم ہند کے فیصلے پر کانگریس کی طرف سے دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:-

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اِس وقت مسٹر جناحؒ کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرنے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(PAKISTAN FACES INDIA P. 99)

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۶ر جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا۔

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

اس سلسلے میں شروع کیا سوچا جا رہا تھا، اس کا انکشاف بھارت کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ "ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن بعض داخلی مصالح کے پیش نظر اس فیصلے پر عمل درآمد نہ ہو سکا" اس سے بھی آگے بڑھئے۔ مسٹر گاندھی نے ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اپنی پرارتھنا کے بعد (صوبہ سرحد کا ذکر کرتے ہوئے) اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ اگرچہ "وہ ہر قسم کے جنگ و جدال کے مخالف رہے ہیں لیکن اگر پاکستان سے انصاف حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ اگر پاکستان اپنی ثابت شدہ غلطی پر نظر ڈالنے سے مسلسل انکار کرتا ہے اور اسے کم کر کے دکھاتا جاتا ہے تو ہندوستانی یونین کی حکومت کو اس کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی۔" (منیپ کے متعلق سپریم کورٹ کا عالیہ فیصلہ)۔

ہندوستانی ہماری بربادیوں کی یہ اسکیمیں اُس وقت تیار کر رہا تھا جب یہاں حالات یہ تھے کہ نہ فوج کی تقسیم ہوئی تھی نہ اسلحہ کی۔ یہ سب ہندوستان کے قبضے میں تھا۔ حتیٰ کہ پاکستان کے حصّے کا نقد روپیہ بھی وہ دبا کر بیٹھ گیا تھا۔ دوسری طرف پناہ گزینوں کے لاکھوں کی تعداد میں، لٹے پٹے خانماں خراب قافلے خون کے دریا عبور کر کے پاکستان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ ایسے نازک وقت میں ہندوستان یہ کچھ سوچ رہا تھا، اور پاکستان کے اندر بیٹھے ہوئے مودودی صاحب اس کی بنیادوں تک کو کھوکھلا کرنے میں مصروف تھے۔ (مثلاً)

حلفِ وفاداری تشکیلِ مملکت کے بعد مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں۔ بعض سرکاری ملازمین نے، جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ تھے امیرِ جماعت سے استصواب کیا اور انہوں نے یہ رائے دی کہ یہ حلف اس وقت تک ناجائز ہے جب تک یہ نظامِ حکومت پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس مشورہ کے مطابق بعض سرکاری ملازموں نے حلفِ وفاداری لینے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی۔ روزنامہ نوائے وقت کی ۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ:-

> سول سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے حکومتِ پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظامِ حکومت شرعی ہو۔ (بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر۔ ص۴۲)

معاملہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا۔ اس جماعت نے پاکستان کی فوج کو برگشتہ کرنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اپریل ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے کہ اخبارات میں شائع شدہ خبر کے مطابق جماعتِ اسلامی کی مجلسِ شوریٰ نے جماعت کے ارکان کے فوج میں بھرتی ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ کیا، جس کی روشنی میں اس جماعت کے قیّم نے چند ماہ بعد ایک خط کے جواب میں لکھا کہ:-

> موجودہ حکومتِ پاکستان غیر اسلامی ہے اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریگولر دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔ (نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء۔ بحوالہ جماعتِ اسلامی پر ایک نظر۔ ص۵۵)

یعنی ہندوستان میں، پاکستان پر حملہ کرنے کی اسکیمیں تیار ہو رہی تھیں اور پاکستان میں مودودی صاحب اس قسم کے فتوے جاری کر رہے تھے! اُسی زمانے میں جہادِ کشمیر کا مسئلہ ابھرا اور مودودی صاحب نے اس میں شرکت کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا۔ یہ داستان عام طور پر معلوم ہے اس لئے میں اس کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔

جیسا کہ میں ابھی ابھی بتا چکا ہوں اس زمانے میں پاکستان کی نوزائیدہ مملکت بڑے عجیب خطرات سے دوچار تھی۔ نئے پیش آمدہ حالات میں اندرونی نظم و نسق کا سنبھالنا ہی کچھ معمولی کام نہ تھا کہ اس کے ساتھ پناہ گزینوں کے سیلاب نے سارا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ اُس وقت ملک میں عجیب ابتری پھیل رہی تھی اور حالات

بڑے پریشان کن تھے۔ ایسے حالات میں تباہی سے محفوظ رہنے کا سہارا ایک ہی تھا اور وہ تھا قائدِاعظمؒ کی ذات پر اہلِ پاکستان کا کلی اعتماد۔ مودودی صاحب کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کا قائدِاعظمؒ کی ذات پر یہ اعتماد باقی نہ رہے، وہ جانتے تھے کہ اگر اس میں تزلزل آجائے تو پھر یہ عمارت سلامت نہیں رہ سکتی۔ مودودی صاحب کے رسالہ ـــــ ترجمان القرآن ـــــ کا پاکستان میں پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے تقسیم ہند کے عواقب کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا:۔

منہ کالا کرنے والی　یہ بحث اُن سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے، جنہوں نے پچھلے رُبع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔ (صفحہ ۴)

اسی پرچہ کی اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں، اس خونچکاں داستان کو دہرانے کے بعد لکھا:۔

> اس پورے گروہ میں . . ایک کو بھی نہ تھا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ یہ ساری جماعت بازی گروں سے بھری پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی، جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔ (صفحہ ۴)

مودودی صاحب نے تقسیم سے پہلے قائدِاعظمؒ کے خلاف جو کچھ لکھا تھا، اُسے ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اور تقسیم کے بعد انہوں نے جن الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے انہیں آپ ابھی ابھی سُن چکے ہیں۔ سوچئے کہ کیا ایسے عظیم قائد کے خلاف اِس سے زیادہ ذلت آمیز اور حقارت انگیز الفاظ کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں؟ ایک طرف یہ دیکھئے اور دوسری طرف مودودی صاحب کا وہ خط ملاحظہ فرمائیے جس کے ساتھ انہوں نے اپنا مفصل مقالہ نوائے وقت کی ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع کرایا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے:۔

> آپ کی معلومات کے لئے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں سے ایک قائدِاعظمؒ مرحوم بھی تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااصول، راستباز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔

قائدِاعظمؒ کا کردار تو مودودی صاحب کے سرٹیفکیٹ کا محتاج نہیں، لیکن اس قسم کی تضاد بیانیوں سے خود مودودی صاحب کا جس قسم کا کردار سامنے آتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں!

ـــــ✕ـــــ

بعض حضرات کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد خود قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں (جبکہ وہ مملکتِ پاکستان کے گورنر جنرل بھی تھے) مودودی صاحب کو یہ کچھ کہنے کی جرأت کس طرح سے ہو گئی؟ اتنا ہی نہیں، جماعتِ اسلامی کے ہمنوا حضرات اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب نے مطالبۂ پاکستان یا قائدِ اعظمؒ کی مخالفت کی تھی تو تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد انہیں ریڈیو پاکستان لاہور سے سلسلۂ تقاریر براڈکاسٹ کرنے کی اجازت کیسے مل گئی؟ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اس جماعت کی تاریخ سے واقف نہیں وہ نہایت آسانی سے اس قسم کے دلائل کے فریب میں آ سکتے ہیں لیکن حقیقت آشنا نگاہیں جب سطح سے نیچے اتر کر گہرائی تک پہنچتی ہیں تو اس میں انہیں بہت کچھ نظر آ جاتا ہے۔ میں نے محترم علی محمد راشدی صاحب کے مقالہ سے جو مختصر سا اقتباس پہلے دیا ہے اس میں انہوں نے کہا ہے کہ "ماسوا دو تین افسروں کے کسی اور سرکاری افسر نے اس زمانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی بلکہ ان میں سے اکثر تو پاکستان کے تخیل کا مضحکہ اڑاتے رہتے تھے اور اس ڈر کے مارے کہ انگریز یا ہندو ان سے خفا نہ ہو جائیں! وہ وِنڈسر پلیس کے راستے سے گذرتے ہی نہیں تھے۔" (واضح رہے کہ وِنڈسر پلیس وہ مقام تھا جہاں سیٹھ عبداللہ ہارون (مرحوم) رکنِ اسمبلی کی حیثیت سے سرکاری مکان میں قیام پذیر تھے اور وہیں پاکستان کی اسکیم مرتب کرنے کا کام ہوا کرتا تھا) اس کے بعد راشدی صاحب نے لکھا ہے۔

بیوروکریسی اور مودودی صاحب

> بعد میں جب پاکستان بن گیا تو اس زمانے کے کئی مخالف افسر۔۔۔ پاکستان کے مرکز اور صوبوں میں بڑے بڑے عہدوں پر قابض ہو گئے اور لوگوں کے سامنے یہ دعوے کرتے رہے کہ وہ شروع سے پاکستان کے لئے کام کرتے رہے تھے۔ حالانکہ ان کے یہ دعوے غلط تھے۔ ان کی ہمدردیاں پاکستان کی طرف اس وقت مڑیں جب ان کو معلوم ہو گیا کہ پاکستان کا وجود میں آنا اب ناگزیر ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۰ مارچ ۱۹۶۷ء)

یہ بالکل صحیح ہے۔ میں خود مرکزی حکومتِ پاکستان سے وابستہ تھا اور یہ تمام حالات میرے بچشمِ دید ہیں۔ ان افسروں کی کیفیت یہ تھی کہ انگریز اور ہندو کے ڈر سے مسلم لیگ کے تو کسی دفتر کے سامنے سے بھی نہیں گذرتے تھے، لیکن ان کے بنگلوں پر مودودی صاحب کی دعوتیں ہوا کرتی تھیں جو تحریکِ پاکستان کے اس قدر مخالف تھے۔ یہی حضرات یہاں پہنچنے پر حکومت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے۔ انہی کے بل بوتے پر تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کی جرأتیں اس قدر بیباک ہو گئیں اور انہی کی سازشوں سے ان کی تقریریں بھی ریڈیو پر نشر ہونے لگیں۔ (ریڈیو پر تقریروں کے علاوہ، مودودی صاحب پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی اسی قسم کی تقریریں کرتے پھر رہے تھے۔) جاننے والے جانتے ہیں کہ اس قسم کے انتظامات نچلے افسروں کے توسط سے سرانجام پا جاتے ہیں۔ گورنر جنرل (قائدِ اعظم) کو نہ اس کی فرصت تھی اور نہ ہی اس کی ضرورت کہ وہ معلوم کرتے پھرتے کہ ریڈیو پر تقریروں کی اجازت کس کس کو مل رہی ہے۔ ویسے بھی وہ بڑے ہی وسیع الظرف واقع ہوئے تھے ۔۔۔ بے محل نہ ہو گا اگر میں اس مقام پر ایک اور اہم نقطہ بھی سامنے لے آؤں جس سے یہ پیدا ہو کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد مودودی صاحب کس بوتے پر اس ملک میں مسلسل انتشار پھیلاتے چلے آ رہے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ خارجہ پالیسی میں ان کا رجحان امریکی بلاک کی طرف ہو گا

چاہیئے۔ اس مقام پر مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی کے پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کھلے الفاظ میں کہا کہ:۔

> اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر معمولی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں۔۔۔۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔ (اخبار تسنیم۔ مورخہ ۱۹ و ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)

میں اس تقریر پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ سب کچھ اپنی زبان سے آپ کہہ رہی ہے۔ حیرت ہے کہ اس پر حکومت کی طرف سے بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا حالانکہ کسی مملکت کے شہری کا بیرونی طاقت کو اس قسم کی دعوت دینا، اپنی مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے ۔۔۔۔۔ انہی دنوں اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوئیں کہ مودودی صاحب چوہدری محمد علی صاحب سے، جو اُن دنوں پاکستان کے وزیرِاعظم تھے، راتوں کو ملاقاتیں کرتے ہیں۔ اس پر ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں حسبِ ذیل خط اخبارات میں شائع کیا گیا:۔

لاہور۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء

محترمی و مکرمی:۔ السلام علیکم

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ چوہدری محمد علی صاحب سے میرے ذاتی تعلقات پندرہ سولہ برس پرانے ہیں اور برادرانہ حد تک ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ میرے ہاں تشریف لاتے تھے اور میں ان کے ہاں جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے۔ ان کی سرکاری پوزیشن اور میری سیاسی پوزیشن کبھی ان تعلقات میں مانع نہیں ہوئی۔ اب ان کے وزیرِاعظم بن جانے کے بعد آخر یہ ذاتی دوستی کیوں ختم ہو جائے۔

بعض لوگوں نے از راہِ شرارت میری اور ان کی ملاقات کو "خفیہ ملاقات" قرار دیا ہے اور اکتوبر کی ایک ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا میرے اور ان کے درمیان کوئی ساز باز ہوا تھا۔ حالانکہ میں جب کبھی کراچی جاتا ہوں، ان سے دو ایک ملاقاتیں ضرور ہوتی ہیں۔ اور چونکہ رات ہی کا وقت میری اور ان کی فرصت کا ہو سکتا ہے اس لئے ملاقات رات ہی کے وقت ہوتی ہے۔ اس ذاتی میل جول کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا ذکر اخبارات میں آئے۔ البتہ جس روز امیر جماعت اسلامی اور وزیرِاعظم پاکستان کی کوئی بات چیت سیاسی گفت و شنید کی نوعیت کی ہوگی تو انشاء اللہ وہ منظرِ عام پر ہوگی۔

افسوس ہے کہ سیاست بازوں کو ہر چیز میں سیاست بازی اور گٹھ جوڑ ہی نظر آتا ہے۔ مگر میں اُن کا ہم جنس نہیں ہوں۔ نہ کسی کی طعن و تشنیع سے اپنی وضع میں تغیر کر سکتا ہوں۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(بحوالہ تسنیم۔ مورخہ ۶/۱/۵۶)

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب پولیس جماعتِ اسلامی کے دفاتر پر چھاپے مار کر اُن کے بہت سے کاغذات لے گئی تھی۔ اس زمانہ کے وزیرِ اعلیٰ (پنجاب) ڈاکٹر خان صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ:

> جماعتِ اسلامی اچھے کام نہیں کر رہی۔ دوسرے ممالک میں ایسی تخریبی کارروائیوں کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ جو لوگ بیرونی ممالک کے سامنے پاکستان کی بھیانک تصویر پیش کریں انہیں کبھی وفادار شہری نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی کارروائیاں کرنے والے کبھی پاکستان کے مخلص بہی خواہ نہیں سمجھے جا سکتے۔
>
> (اس کے بعد انہوں نے کہا کہ) حال ہی میں حکومتِ مغربی پاکستان کو ڈاک خانہ کے سنسر کے دوران قابلِ اعتراض مطبوعہ لٹریچر ہاتھ آیا جو مشرقِ وسطیٰ کی بعض سیاسی جماعتوں کے نام بھیجا جا رہا تھا۔ جماعتِ اسلامی کے دفاتر پر چھاپے اسی بنا پر مارے گئے ہیں۔ (بحوالہ ڈان - مورخہ ۲۶/۱ ۵۶)

باب چہارم

(اقامتِ دین کے نقاب میں)

جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، ہندوؤں اور انگریزوں کی سازش کا پہلا گوشہ یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان وجود ہی میں نہ آئے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب نے کیا کردار ادا کیا اسے میں مختصر الفاظ میں پیش کر چکا ہوں۔ ان کی سازش کا دوسرا گوشہ یہ تھا کہ اگر یہ مملکت وجود میں آ جائے تو یہ اسلامی مملکت نہ بننے پائے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس ضمن میں مودودی صاحب نے کیا اسکیم تیار کی اور اس پر کس طرح عمل پیرا چلے آ رہے ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ ان الفاظ کو سن کر آپ کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور آپ کہیں گے کہ جو شخص اقامتِ دین کا داعی ہے اس کے متعلق یہ کیسے کہا جا سکے گا کہ وہ اس مہم میں مصروفِ سعی و کاوش ہے کہ پاکستان، اسلامی مملکت نہ بننے پائے! میری آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ جس طرح آپ نے اس داستان کے پہلے حصہ کو غور و خوض سے سنا ہے، اس دوسرے حصہ کو بھی ٹھنڈے دل سے سنیئے اور پھر جو نتیجہ آپ کا جی چاہے اخذ کر لیجئے — اس سلسلے میں سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی مملکت کا قائم رہنا اسی صورت میں ممکن ہے جب مملکت کا ایک ضابطۂ قوانین ہو جو ساری مملکت کے باشندوں پر یکساں طور پر لاگو ہو سکے۔ اسلامی مملکت میں اسلامی قوانین کا اس قسم کا ضابطہ اس مملکت کے قیام اور استحکام کی اولین شرط ہے۔ پاکستان پہنچتے ہی مودودی صاحب نے یہ مطالبہ پیش کرنا شروع کر دیا کہ چونکہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں قوانینِ شریعت کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ بظاہر یہ مطالبہ بڑا معقول، معصوم، مقدس اور عین مطابق اسلام دکھائی دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس سے ایک بہت بڑے فتنے کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ اگر مودودی صاحب اس فتنہ کو اسلام

کے نام سے پیش نہ کرتے تو یہ کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔ انہوں نے بہت پہلے اپنی اس چنگاری کو ہوا دیتے ہوئے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں نظامِ جاہلیت، مملکت کے اندر گھس آیا تھا، لکھا تھا کہ:

> سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے اور مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اُس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان اعلانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۳۵)

قوانینِ شریعت نافذ کرو

مودودی صاحب نے یہی ٹیکنیک اختیار کی اور انگریز اور ہندو کے اُسی داعیہ کو اسلام کے نقاب میں پیش کر دیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔ یہاں آتے ہی حکومت سے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اسلامی قوانین نافذ کرو۔ اس سے ذہن میں یوں آتا ہے گویا اسلامی قوانین کسی کتاب کے اندر منضبط تھے جسے یا تو حکومتِ پاکستان انڈیا سے اپنے ساتھ لائی تھی اور یا وہ یہاں کسی لائبریری یا ایوانِ حکومت میں رکھی تھی اور حکومت کا فریضہ یہ تھا کہ وہ اُن قوانین کو حکومت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ کر دے۔ یہ تھا وہ تاثر جو یہاں دیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انڈیا اور پاکستان تو ایک طرف، دنیا میں کہیں بھی کوئی ضابطۂ قوانین ایسا موجود نہیں تھا جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیتے۔ صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے تھے اور ہر فرقے کے پرسنل لاز اپنے اپنے تھے جن میں وہ کسی قسم کا تغیر و تبدل جائز قرار نہیں دیتے تھے۔ باقی رہے پبلک لاز، تو وہ مختلف سلطنتوں کے وضع کردہ تھے۔ ہندوستان میں یہ قوانین، برطانوی حکومتِ ہند کے مرتب کردہ تھے اور اُس حصۂ ملک میں بھی نافذ تھے جسے اب پاکستان کہا جاتا تھا۔ ان حالات میں حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ ملک میں فوراً قوانینِ شریعت نافذ کرو، کتنا بڑا فتنہ در کنار تھا۔ مختلف فرقوں کے اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نماز میں آمین، اونچی آواز یا خفی آواز سے کہنے پر مسجدوں میں سر پھٹول ہو جاتی ہے۔ معاملہ عدالتوں تک پہنچتا ہے۔ مسجدوں میں تالے پڑ جاتے ہیں۔ باہر فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جاتے ہیں۔ پبلک لاز تو ایک طرف، پرسنل لاز میں باہمی اختلاف کا اندازہ اس ایک مثال سے لگایئے کہ جب حکومت نے ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین نافذ کئے تو مولانا محمد داؤد غزنوی (مرحوم) نے جو مرکزی جمعیت اہلحدیث کے صدر تھے، کہا کہ ان میں سے بعض قوانین جزئی ترمیمات کے ساتھ قبول کئے جا سکتے ہیں۔ اسی جمعیت اہلحدیث کے حلقہ لاہور کے صدر

مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ "یہ مولانا غزنوی کا ذاتی خیال ہے جس کی پابندی اہلِ حدیث پر لازم نہیں" (روزنامہ کوہستانی لاہور - مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۶۳ء) اس کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار، ایشیاء نے مولانا غزنوی پر سخت تنقید کی اور لکھا:

> مولانا جب یہ استدلال کر رہے ہیں تو ہم حیرت کے ساتھ سوچ رہے ہیں کہ ان کے قلم سے مولانا محمد داؤد غزنوی امیرِ مرکزی جمیعتِ اہلِ حدیث بول رہے ہیں یا منکرینِ سنت کے سرخیل غلام احمد پرویز۔ حکومت کے سربراہ اور امیرِ مملکت کو، وہ کیسے ہی باشد، حضرتِ عمرؓ کے مقام پر رکھ کر شریعتِ اسلامی کی تعبیر کرنے کا حق دینا، وہ ضال اور مضل نظریہ ہے جس نے عہدِ حاضر میں اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ (ایشیاء ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

یہ پرسنل لاز میں اختلاف کی ایک مثال ہے۔ جہاں تک پبلک لاز کا تعلق ہے اس اختلاف کی شدت کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کا ذکر ہے کہ کراچی سے شائع ہونے والے ماہوار مجلہ تجلیات نے جس کے نگران مولانا محمد یوسف بنوری ہیں، اور جو حنفی مسلک کا ترجمان ہے، یہ تجویز پیش کی کہ چونکہ پاکستان میں حنفی مسلمانوں کی اکثریت ہے، اس لئے یہاں فقۂ حنفی کے مطابق پبلک لاز نافذ کئے جائیں۔ فرقۂ اہلِ حدیث کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوئی، حتیٰ کہ ان کے ترجمان مجلہ الاعتصام نے لکھا کہ:

> فقۂ حنفی کو قانونی حیثیت دے دینا تو بڑی بات ہے، اس مطالبہ کا خیال بھی نہیں کرنا چاہیئے۔

دوسری طرف شیعہ حضرات نے اس کے خلاف سختی سے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ جب ہم اس فقہ کو اسلامی ہی تسلیم نہیں کرتے تو اسلامی قانونِ مملکت کی حیثیت سے اس کی اطاعت کیسے کریں گے؟ انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ:

> اگر سوادِ اعظم کے رہنماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے، خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی۔

یہ تمام بحث طلوعِ اسلام - اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ان حالات میں عزیزانِ من! آپ سوچئے کہ مودودی صاحب کی طرف سے یہ مطالبہ کہ ملک میں فوراً قوانینِ شریعت نافذ کرو، کیا معنی رکھتا تھا؟ اگر حکومت ان کے دامِ فریب میں آ کر کسی ایک فرقے کی فقہ کو بھی بطورِ قانونِ مملکت نافذ کر دیتی تو یہاں ایسی سول وار (خانہ جنگی) شروع ہو جاتی جس کے بعد اس مملکت کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا۔ انہوں نے سمجھ سے کام لیا اور ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا۔ لیکن مودودی صاحب کو اس سے حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ وہ

نفرت انگیزی کی مہم

اس وقت سے آج تک ہر حکومت کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلاتے چلے آ رہے ہیں کہ دیکھئے! یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن اربابِ اقتدار یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں کر رہے۔ اصل یہ ہے کہ ان کا یہ ارادہ ہی نہیں کہ یہ مملکت اسلامی بن جائے۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں یہ شوشہ چھوڑا اور ۱۹۶۶ء تک اسے برابر ہوا دیتے اور ملک میں مسلسل خلفشار پھیلاتے چلے آ رہے ہیں، اور نعرہ

ایسا مقدس اور نازک ہے کہ کوئی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتا۔ حتیٰ کہ انہوں نے ابھی (مئی ۱۹۷۶ء میں)۔ جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی وکلاء کانفرنس میں یہ فرمایا کہ:-

> یہاں معاملہ یہ ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششیں کی گئیں اور یہ حاصل اس لئے کیا گیا کہ ہم یہاں اسلامی قوانین نافذ کریں گے۔ پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ بیان کیا گیا۔ لاکھوں آدمیوں کی جانیں کٹوا دی گئیں۔ لاکھوں آدمیوں کی عزتیں گنوا دی گئیں اور لاکھوں کی جائیدادیں تباہ کروا دیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب ملک حاصل ہو گیا تو اس کام کو چھوڑ دیا گیا جس کے لئے ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا جو کیا گیا اور اس سے زیادہ دھوکہ بازی کوئی نہیں ہو سکتی کہ ملک حاصل کرتے وقت تو نام اسلام کا لیا جائے مگر پھر ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام کو نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (ایشیا۔ مورخہ ۹ مئی ۱۹۷۶ء)

"طاہرہ میکلی" میں یہ الفاظ چھپے کہ:-

> مطلوبہ سرزمین قائم ہونے کے فوراً بعد ہی یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہاں اسلام قائم نہیں ہوگا۔

طلوعِ اسلام نے اِن کے خلاف سختی سے احتجاج کیا اور کہا کہ اور تو اور خود قائدِ اعظمؒ کی شان میں یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ ملک کے بعض دوسرے جرائد نے بھی اس احتجاج کی تائید کی اور مودودی صاحب کو مجبوراً ۱۴ر اگست ۱۹۷۶ء والا مقالہ شائع کرنا پڑا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں قائدِ اعظمؒ شامل نہیں۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس سے بتانا یہ مقصود تھا کہ مودودی صاحب اس ایک فقرہ سے جو بظاہر بڑا معصوم نظر آتا ہے، کتنے بڑے فتنے کو پھیلاتے چلے آرہے ہیں۔

سارے ملک میں صرف طلوعِ اسلام ایسا مجلہ ہے جو مودودی صاحب کی اس سازش کو پیہم اور مسلسل بے نقاب کرتا چلا آرہا ہے۔ مودودی صاحب کے اس مطالبہ پر اس نے کہا کہ ایسا ضابطہ قوانین موجود نہیں جسے ملک میں نافذ کر دیا جائے۔ اسے مرتب کرنا ہوگا۔ اس پر مودودی صاحب نے ایک اور چال چلی۔ مطالبہ پیش کر دیا کہ کتاب و سنت کے مطابق اس قسم کا مجموعۂ قوانین مرتب کیا جائے۔ یہ مطالبہ پہلے سے بھی زیادہ معقول اور مطابقِ اسلام دکھائی دیگا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں سنت، رسول اللہ کا ذکر کر کے امت کے انتہائی نازک جذبات سے بھی کھیلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ آپ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ اس مطالبہ میں کونسی تخریبی سازش پنہاں ہو سکتی ہے؟ سنت کی بحث بڑی پیچیدہ

بحثِ سنت

اور اصطلاحی سی ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ اسے عام فہم الفاظ میں بیان کروں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے مختلف فرقے ہیں اور ان کی اپنی اپنی فقہ ہے۔ اُن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ ان کی فقہ کا مدار سنتِ رسول اللہ پر ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ہر فرقہ کے نزدیک سنت کا الگ الگ تصور اور اس کا الگ الگ مجموعہ ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سنت کی بنیاد پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ مودودی صاحب ۲۵ سال سے اس اصطلاح کو دہراتے چلے آرہے ہیں لیکن سنتِ رسول اللہ کا کوئی ایسا مجموعہ پیش نہیں

کر سکے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ تسلیم کر لیں۔ سنت کا کوئی مجموعہ پیش کرنا، تو ایک طرف، انہوں نے سنت کی جو (DEFINITION) پیش کی اور اس کے صحیح ہونے کا جو معیار بتایا اس کی بڑی شدت سے مخالفت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ احادیث کے صحیح اور غلط ہونے یا سنتِ رسول اللہ کے سنت قرار دیئے جانے کا معیار یہ ہے کہ جس چیز کو "مزاج شناسِ رسولؐ" صحیح قرار دے دے اُسے صحیح سمجھا جائے۔ اور، جیسا کہ منیر کمیٹی کے سامنے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے (جو اس زمانے میں مودودی صاحب کے دستِ راست تھے) اعتراف کیا تھا، اس جماعت کے نزدیک "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ اس پر اس زمانے کے جمعیتِ اہلحدیث کے صدر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے لکھا تھا۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصور کر لے، پھر اُسے اختیار دیدے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے، جسے چاہے رد کر دے۔ ۔ ۔ ۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔
> ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث صفحہ ۶۳)

یہ تمام بحث اُس مقالہ میں دیکھی جا سکتی ہے جو "کتاب و سنت" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کی جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ آپ اس بحث میں پڑیئے ہی نہیں۔ آپ جماعتِ اسلامی کے کسی ذمہ دار رکن سے پوچھئے کہ کیا مودودی صاحب نے آج تک کسی ایسی کتاب کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں سنتِ رسول اللہ مرتب شکل میں منضبط ہو اور جسے تمام فرقے مستند سنتِ رسول اللہ تسلیم کرتے ہوں۔ ان کا جواب خود مودودی صاحب کے مطالبہ کی قلعی کھول دے گا۔ بہرحال، صورت یہ ہے کہ مودودی صاحب کی طرف سے آج تک نہ تو سنتِ رسول اللہ کا کوئی متفق علیہ مجموعہ پیش کیا جا سکا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی متفق علیہ تعریف۔ لیکن اس کے باوجود، وہ مسلسل شور مچاتے چلے جاتے ہیں کہ مملکتِ پاکستان کا ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کیا جائے اور جب ایسا نہیں کیا جاتا تو وہ حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں کہ یہ فریب کار ہیں، فراڈیئے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں — ان کی اسی طوفان آرائی کا اثر ہے کہ خود آئینِ پاکستان میں یہ شق شامل کر دی گئی ہے اور آئین مرتب کرنے والوں میں سے کسی نے نہیں پوچھا کہ اس اہم شق کا عملی مفہوم کیا ہے؟

اس مقام پر عزیزانِ من! شاید آپ بھی سر پکڑ کر بیٹھ جائیں اور دل ہی دل میں کہیں کہ بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے کہ جب کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا تو ظاہر ہے کہ اسلام کی بنیادوں پر کوئی مملکت متشکل ہی نہیں کی جا سکتی؟ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس مسئلہ کو سطحی طور پر دیکھ کر اسلام کے متعلق ایسے مایوس نہ ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ مودودی صاحب کا یہ جادو۔ اس لئے بھی چل گیا ہے کہ قوم اس قدر پریشانیوں میں اُلجھی ہوئی ہے اور ہر ایک کو اس طرح نفسا نفسی

بڑی ہوئی ہے کہ اس قسم کے مسائل پر توجہ دینے کی کسی کو فرصت ہی نہیں۔ کوئی اسے (SERIOUSLY) لے ہی نہیں رہا۔ ورنہ بات کچھ ایسی نہ تھی جو سمجھ میں نہ آ سکتی۔ میں شروع میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو وہ ان تمام مشکلات سے واقف تھے جو اس سلسلے میں پیش آ سکتی تھیں اور اس کا حل انہوں نے اسی زمانے میں تجویز کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ ہر فرقہ کی فقہ الگ الگ، احادیث کے مجموعے الگ الگ اور سنت کا تصور الگ الگ ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے اور وہ ہے

قانون سازی کا اصول

خدا کی کتاب ـــــ قرآن مجید ـــــ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا اصول یہ ہونا چاہئیے کہ قرآن مجید کے اصول و قوانین اور حدود کو غیر متبدل رکھا جائے۔ ہماری فقہ اور احادیث میں جو کچھ قانون کی حیثیت سے آیا ہے، قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا جائے۔ جو اس کے خلاف نہ ہوں اور ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں' انہیں اختیار کر لیا جائے۔ باقی امور کے لئے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی مملکت خود قوانین وضع کرے۔ قرآن کی حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی اور اس کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلے جا سکیں گے۔ ثبات اور تغیر کے اس امتزاج سے، اسلام "قیامت" تک نظامِ مملکت بن سکنے کے قابل رہے گا۔ مودودی صاحب کے ناممکن العمل مطالبوں کے مقابلے میں، میں نے علامہ اقبالؒ کا یہ مسلک پیش کیا، اس لئے کہ خود میرے نزدیک بھی یہی مسلک قرآنی منشاء کے مطابق ہے۔

مودودی صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جس مقصد کے لئے وہ یہ کھیل کھیل رہے ہیں، طلوعِ اسلام اُسے بے نقاب کر دے گا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنا وہی مجرب نسخہ استعمال کیا۔ یعنی یہ مشہور کر دیا کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ شانِ رسالت ہے، منکرِ سنت ہے، تین نمازوں اور تیس روزوں کی تلقین کرتا ہے، اُردو میں نماز پڑھنے کی تجویز کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر شق صریح جھوٹ ہے۔ لیکن انہوں نے گوئبلز کی ٹیکنیک کی رُو سے اس جھوٹ کو اس تکرار و اصرار سے دہرایا ہے کہ سطح بین نگاہوں کو یہ سچ بن کر دکھائی دینے لگا ہے۔ اپنے اس پراپیگنڈہ کے لئے انہوں نے ایک اور حربہ بھی استعمال کیا۔ انہوں نے اسٹوڈنٹس کی بے بہری فوج کو (جس کے ساتھ میری ساری ہمدردیاں شامل ہیں کہ ہمارا مستقبل وابستہ ہی ہماری اس آنے والی نسل کے ساتھ ہے۔) اسلامی جہاد کا نعرہ دے کر اپنے پیچھے لگا لیا۔ مقصد یہ تھا کہ جب تک وہ اسٹوڈنٹ رہیں ملک میں انتشار پھیلاتے رہیں۔ اس کے بعد وہ مختلف شعبوں میں ملازمتیں حاصل کر کے حکومت کی انتظامیہ میں دخیل کار ہو جائیں۔ چنانچہ آج حکومت کے محکموں میں شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں اُن کے پراپیگنڈہ کے یہ آلۂ کار، اختیارات کی کرسیوں پر متمکن نہ ہوں۔ ان کا سب سے بڑا "جہاد" پرویز اور طلوعِ اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ ہے، اور وہ اس میں برابر مصروف رہتے ہیں کیونکہ اُنہیں بتایا گیا ہے کہ یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ایک دفعہ مودودی صاحب کے معتقدین میں سے کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ طلوعِ اسلام تو حدیث کے متعلق وہی تصوّر سامنے لا رہا ہے جیسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا۔ اگر طلوعِ اسلام اس بنا پر منکرِ حدیث قرار پاتا ہے تو علامہ اقبالؒ کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ:۔

> اس بارے میں، میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے اس مسئلہ کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں کہ حدیث کے متعلق اقبالؒ مرحوم کا نظریہ کیا تھا اور کیا نہ تھا۔ اگر ہمارے پاس اس معاملہ میں صاف اور واضح نصوص اور خلفائے راشدین سے لے کر آج تک کے تمام علمائے اُمت کا متفقہ طرزِ عمل نہ ہوتا تو شاید ہم اس کے محتاج ہوتے کہ حدیث کے متعلق علامہ اقبالؒ کا نظریہ معلوم کرتے۔ لیکن ان حجتوں کی موجودگی میں یہ چیز تلاش کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۶۰ء)

اقبالؒ کے سلسلہ میں تو احادیث کی سند کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے اور خود اپنے متعلق ارشاد ہے کہ:۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی فریقِ مخالف) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اول صفحہ ۲۷۱۔ ستمبر ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ان کے نزدیک احادیث کے صحیح اور غلط ہونے کی سند مزاج شناسِ رسولؐ ہیں۔ یعنی خود مودودی صاحب (جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" کا مطالعہ فرمالیں۔) بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مودودی صاحب "کتاب و سنت" کے مقدس نقاب میں معاشرہ میں انتشار اور ہر حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات پھیلاتے چلے گئے اور پھیلاتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی وکلاء کانفرنس کی تقریر میں (جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) یہ بھی کہا کہ:۔

> اس مقصد کے لئے سرکاری طور پر ایک کمیٹی بٹھا دی جاتی تو چند مہینوں میں اسلامی قانون مدون کیا جا سکتا تھا۔ کوئی دقت نہ تھی۔ دقت صرف یہ تھی کہ ان کے اندر خواہش اور ارادہ موجود نہیں تھا۔ اور اب بھی موجود نہیں ہے۔

صدر ایوب کی پیشکش

دوسری حکومتوں کو تو چھوڑئیے۔ مرحوم صدر ایوب نے ۱۹۶۸ء میں خود یہ تجویز پیش کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ:۔

> اپوزیشن کے راہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جاتے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جو اس طرح خدا اور رسولؐ کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ میں نے علماء سے کہا

کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری ہائیکورٹ اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔
...... اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں۔ (نوائے وقت۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

مودودی صاحب اگر اسلامی قوانین کے مطالبہ میں ذرا بھی دیانتدار ہوتے تو انہیں صدرِ مملکت کی اس پیشکش پر فوراً لبیک کہنا چاہئیے تھا۔ لیکن اس سے تو ان کا سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ لہٰذا اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ شخص (صدر ایوب) بدنیت ہے اور علماء کے اختلاف کو خواہ مخواہ سپر بنا رہا ہے۔ (نوائے وقت۔ مورخہ ۲۰ر جنوری ۱۹۶۹ء) مودودی صاحب کی اسی قسم کی چہرہ بازیاں تھیں جن سے تنگ آ کر صدر ایوب مرحوم نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا کہ:-

اب ایک اوروں سے زیادہ مکار شخص مذہب کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آگیا ہے۔ یہ شخص سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ (امروز لاہور۔ ۲ر دسمبر ۱۹۶۳ء)

لیکن عزیزانِ من! اس قسم کی تقاریر اور بیانات کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے اور ان کا اثر بھی ہنگامی۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کی پروپیگنڈہ کی مشینری مسلسل اور متواتر مصروفِ عمل چلی آ رہی ہے، اور یہ زر و سیم کے اس سیلاب کے بل بوتے پر جس کے منبع کا آج تک کسی کو پتہ نہیں چل سکا کہ کہاں ہے۔ اس کے مقابلے میں طلوعِ اسلام اپنی بے سروسامانی کے باوجود برابر ان کا تعاقب کئے چلا آ رہا ہے اور اپنی اس پکار کو دہرائے جاتا ہے کہ "کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نحیف و نزار آواز کا اثر کیا ہوا۔ غالباً آپ پہلی بار یہ سن رہے ہونگے کہ مودودی صاحب کو بالآخر اس کا اعلان اور اعتراف کرنا پڑا کہ:-

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے، جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

ان کا یہ اعتراف ان کی جماعت کے ترجمان اخبار ایشیاء کی ۲۳ر اگست ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ طلوعِ اسلام اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے، کہ اس کی مسلسل اور پیہم کوششوں کے بعد مودودی صاحب کو یہ تسلیم کرنا پڑا۔ کہ ان کا مطالبہ واقعی ناممکن العمل ہے۔ اس کی بنا پر پبلک لاز کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا، جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) آپ [illegible] ہوں گے (اور ہر سمجھدار [illegible] یہی سمجھے گا) کہ اس کے بعد مودودی صاحب نے یہ مطالبہ ترک کر دیا ہوگا اور طلوعِ اسلام کا پیش کردہ مسلک اختیار کر لیا ہوگا۔ لیکن وہ مودودی صاحب ہی کیا ہوئے، جو حق

کے اعتراف کے بعد اپنا باطل مسلک چھوڑ دیں؛ انہوں نے یہ کچھ سنہ ۱۹۷۰ء میں کہا اور اس کے بعد وہ پھر آج تک اس مطالبہ کو برابر دہراتے چلے آرہے ہیں کہ کتاب و سنت کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کرکے ملک میں نافذ کیا جائے۔ حتیٰ کہ اسے انہوں نے اپنی جماعت کے منشور میں بھی بدستور شامل کئے رکھا، اور ۱۹۷۳ء کے آئینِ پاکستان میں بھی یہ شق لکھوا دی (آرٹیکل ۲۲۷) یہ ہے وہ مقام عزیزانِ من! جس پر ہم آج کھڑے ہیں۔

آپ کے دل میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا مودودی صاحب نے کوئی ایسا طریق بھی بتایا جس سے یہ ناممکن العمل مسئلہ ممکن ہو جائے اور پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی صورت پیدا ہو سکے؟ انہوں نے اس کا عملی حل بتایا ہے، اور وہ حل ان کی اس تقریر میں دیا گیا ہے جو انہوں نے وکلاء کنونشن میں کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:۔

اقتدار مجھے دو

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قانون کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں، دل سے مانتے بھی ہیں اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود ہیں اور جس وقت ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے۔

ان سے کسی نے نہیں پوچھا کہ جب اسلامی احکام کا ضابطہ آپ کے تھیلے میں بنا بنایا موجود ہے اور آپ اسے اقتدار سنبھالنے کے دوسرے ہی روز نافذ کر دیں گے تو آپ نے آج تک اسے چھپائے کیوں رکھا؟ اسے قوم کے سامنے پیش کیوں نہ کر دیا؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ (TRADE SECRET) ہے قیمت وصول کئے بغیر اس راز کو کس طرح افشا کر دیا جائے۔

اور یہ بھی کسی نے نہیں پوچھا کہ جب آپ کہتے ہیں کہ کتاب و سنت کی رو سے ایسا ضابطۂ احکام مرتب ہی نہیں ہو سکتا تو جو ضابطہ آپ کے تھیلے میں ہے اسے آپ نے کن بنیادوں پر مرتب کیا ہے؟ میں آپ احباب سے سفارش کرتا کہ آپ کسی طرح مودودی صاحب کو اقتدار دلا دیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے آپ کی جان عزیز ہے۔ اور مودودی صاحب لگی لپٹی بغیر اعلان کر چکے ہیں کہ:۔

> جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کرکے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (کتابچہ "مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں" اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن ص ۷۱)

ظاہر ہے کہ اسلام سے مراد وہی اسلام ہوگا جس کا سرٹیفکیٹ مودودی صاحب عطا فرما دیں!

جنرل یحییٰ خاں

آپ کو معلوم ہے کہ اس کا معیار کیا ہوگا؛ نہیں معلوم تو سُن لیجئے۔ جماعت اسلامی کے اُس زمانے کے قائم مقام امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے ۴ دسمبر ۱۹۶۹ء کو اپنی جماعت کے کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے، جنرل یحییٰ خاں کے متعلق فرمایا:

مجھے قوی امید ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا جو سلسلہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی شہادت سے منقطع

ہوا تھا، اس کی بحالی کا آغاز، انشاء اللہ حضرت علیؓ (رضی اللہ عنہ) ہی کے عاشقوں میں سے ایک شخص کے ہاتھوں پاکستان کی سرزمین سے ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ یحییٰ خاں صاحب کو عزم و ہمت اور اسی اخلاص کے ساتھ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام بحال کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کا انہوں نے بار بار اپنی تقریر میں ذکر فرمایا ہے۔ آمین! (ایشیا۔ ۴ دسمبر ۱۹۶۹ء)

یہ ہوگا ان حضرات کو سرٹیفکیٹ عطا کرنے کا معیار! سچ ہے —— کند ہم جنس با ہم جنس پرواز!

میں کسی کے خلاف کوئی الزام نہیں تراشا کرتا۔ ایک دوست نے لندن سے شائع ہونے والے ہفتہ وار جریدہ "اخبارِ وطن" مورخہ (۲۶ - ۱۹ مئی ۱۹۷۶ء) کا تراشا بھیجا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "سنہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کی اندرونی کہانی"۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

> یحییٰ خان نے انتخابات کے لئے چار کروڑ روپیہ کا خفیہ فنڈ قائم کیا تھا جسے مختلف سیاسی جماعتوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس میں سے (۷۵) لاکھ روپیہ جماعتِ اسلامی کو دیا گیا۔

ہم اس خبر کی تردید یا تصدیق نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو اس قسم کے سرٹیفکیٹوں کی فیس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میرے اس خطاب کا عنوان تھا —— اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش —— میں نے جو کچھ آپ احباب کے سامنے پیش کیا ہے اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اگر مودودی صاحب کی مخالفت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور یہ سازش بدقسمتی سے کامیاب ہوتی چلی جائے، تو اس کے بعد یہاں اسلام اور مملکتِ پاکستان کا وجود بھی باقی رہ سکے گا؟ تقسیم ہند کی وجہ جواز یہ تھی کہ ہم ایک ایسی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے جس میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو سکے۔ اور جب دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلامی قوانین کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب ہی نہیں ہو سکتا جسے پبلک لاز کی حیثیت سے ملک میں نافذ کیا جا سکے، تو اس سے ہماری اس جداگانہ مملکت کی وجہ جواز ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہاں یہ سوال ابھریگا کہ اس مملکت کو دنیا کی دوسری مملکتوں کی طرح سیکولر سٹیٹ بنا دیجئے۔ جیسا کہ تقسیم سے پہلے ہندو لیڈروں نے کہا تھا۔ مذہب کی بنیادوں پر مملکتوں کے قیام کا دور ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں کی نئی نسل نے یہ کہنا شروع بھی کر دیا ہے۔ اور جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اب اسلامی نظام کا قیام ناممکن ہے، تو اس سے اسلام کے متعلق خود بخود یہ تاثر قائم ہو جائیگا کہ یہ ایک خیالی ہیولا کا تصور ہے۔ اسے یوں لئے لئے پھرنے سے فائدہ کیا ہے؟ یہ خیال بھی اب عام ہو رہا ہے۔ اور یہ سب اسی سازش کا صدقہ ہے جسے لے کر مودودی صاحب یہاں تشریف لائے تھے۔

مودودی صاحب کا اسلام

میں یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ مودودی صاحب اسلام کس قسم کا پھیلا رہے ہیں۔ لیکن یہ عنوان بجائے خویش، ایک مستقل موضوع ہے اور بڑا تفصیل طلب۔ اور میرا یہ خطاب پہلے ہی کافی طویل ہو چکا ہے۔ اس لئے میں اس مجلس میں اس موضوع پر تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سردست میں اس اسلام کے نمایاں خطوط نظر پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جسے مودودی صاحب نے یہاں عام کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل اسلام سے برگشتہ ہی نہیں متنفر ہو رہی ہے۔ اسلام کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اس کے اصول خدا کی طرف سے نازل کردہ ہیں اس لئے غیر متبدل اور بے لچک ہیں۔ مودودی صاحب کا پیش کردہ اسلام یہ ہے کہ اسلامی نظام کی دعوت کے آغاز میں بڑے بڑے پاکیزہ اور دلکش اصول پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن جب اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد ان پر عمل کرنے کا وقت آئے، تو انہیں تہ کر کے رکھ دینا چاہیئے۔ اس کے لئے وہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) وضعی روایات کے سہارے خود رسول اللہ کی مثال

پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ۔ امام قریش میں سے ہوں۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۲۳)

آپ سوچئے عزیزانِ من! کہ وضعی روایات کی آڑ میں اس قسم کے مسلک اور میکیاولی سیاست کے سیکولر نظریہ میں کیا فرق ہے؟ اسلام کا دوسرا بنیادی اصول، راستبازی اور حق گوئی ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:

راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۴)

اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ خود مودودی صاحب، اپنے بیانات میں جس دھڑلے سے کذب بیانی سے کام لیتے ہیں اور ان کے متبعین (جماعت اسلامی والے) جس دیدہ دلیری سے دوسروں کے خلاف الزام تراشتے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

اسی قسم کا تھا مودودی صاحب کا وہ اسلام جس سے تنگ آ کر ان کی جماعت کے بعض ممتاز ترین ارکان نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اور ان کے سرخیل، امین احسن اصلاحی صاحب نے کہا تھا کہ میں سولہ سال تک ایک راہ گم کردہ قافلہ کے ساتھ رہ کر اسے بالآخر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اور یہی ہے وہ اسلام جسے مودودی صاحب بالخصوص طالب علموں میں عام کر رہے ہیں ــــ جھوٹ بولو۔ اصول شکنی کرو۔ فریب سے کام لو! اسی اصول شکنی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع آئے دن بدلتا رہتا ہے ــــ الیکشن میں حصہ لینا قطعاً ناجائز ہے۔ الیکشن لڑنا عین مطابق اسلام ہے۔ عورت کا سیاست میں حصہ لینا تو ایک طرف، وہ شرعاً ووٹ بھی نہیں دے سکتی۔ عورت سربراہ مملکت کے منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہو تو اس کی تائید و حمایت شرعی فریضہ ہو جاتا ہے۔ زمین پر ایک انچ کی حد ملکیت مقرر کرنا بھی خلاف اسلام ہے ــــ زمین کی ملکیت ڈیڑھ سو ایکڑ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ وغیرہ ذالک۔ ان موضوعات پر طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

جنسیاتی اسلام

اس کے بعد آپ دو چار مثالیں اُس شعارِ زندگی کی بھی ملاحظہ فرمائیے جسے مودودی صاحب اسلامی قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ۔۔۔ آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اگر ان کی زندگی میں مودودی صاحب کے فقہی مسائل سامنے آ جاتے تو وہ اپنے پہلے مصرعہ میں ان کے نامِ نامی کا بھی اضافہ فرما دیتے، خواہ اس کے لئے انہیں بحرِ طویل بھی کیوں نہ اختیار کرنی پڑتی۔ میں مودودی صاحب کی اسی فقہ کی دو چار مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں گا اور آپ کے ذوقِ سلیم سے صد معذرت کے ساتھ ــــ

(۱) ان کا ارشاد ہے کہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا حدِ تعداد اپنے استعمال میں لائیں گے۔ اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دیں گے۔ حتیٰ کہ انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ اس کی پوری تفصیل ان کی کتاب — تفہیمات حصہ دوم — (اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن۔ صفحات ۳۲۴-۲۹۰) میں "غلامی کا مسئلہ" کے تابع دی گئی ہے۔ پھر انہوں نے اسے اپنی تفسیر تفہیم القرآن کی پہلی جلد میں بھی دہرایا ہے۔ (۱۹۵۱ء ایڈیشن صفحہ ۳۴۰)

(۲) وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۷۱ (طبع اوّل) پر لکھتے ہیں کہ نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ خاوند کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ (نیز ترجمان القرآن۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء)

نابالغ لڑکی کے ساتھ جنسی اختلاط! استغفر اللہ۔

(۳) ان سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی۔ جواب دیا کہ:

کفار کی لڑکیاں جو کمسنی میں وفات پا گئی ہوں گی، انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔ (ایشیا ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)

اسی کو انہوں نے تفہیم القرآن، جلد چہارم (طبع اوّل) صفحہ ۲۸۵ پر دہرایا ہے اور جلد پنجم (طبع اوّل) صفحہ ۲۷۵ پر اس پر یہ اضافہ کیا ہے۔

اہلِ جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں (محلات) میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

یعنی جنتی مومنین کی بیویاں تو گھروں میں رہیں گی لیکن جب وہ باہر پکنک منانے جائیں گے تو یہ حوریں (یعنی کفار کی کمسن بچیاں جنہیں نوخیز لڑکیاں بنا دیا جائے گا) ان کے خیموں میں لطف و لذت کا سامان بہم پہنچائیں گی!

(۴) ان سے (MASTURBATION) یعنی مشت زنی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا:

ان دلائل کی بنا پر صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ فعل حرام ہے۔ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اس کی حرمت زنا اور عملِ قومِ لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کمتر ہے اس لئے اگر کسی شخص کو ان گناہوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اور اس سے بچنے کے لئے وہ اپنے جوشِ طبع کی تسکین اس ذریعے سے کر لے تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسے سزا نہ دے۔

(رسائل و مسائل۔ جلد دوم۔ ستمبر ۱۹۶۲ء ایڈیشن۔ صفحہ ۲۰۳)

(۵) نکاح کی یہ انوکھی شکل بھی ملاحظہ فرمائیے:

فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ایک مرد اور ایک عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر مجبور ہیں اور شرعی شرائط کے مطابق ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اُس وقت تک کے لئے عارضی نکاح کر لیں جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی ان تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش

؎ دشمنانِ اسلام نے ہماری کتبِ احادیث میں ایسی وضعی روایتیں داخل کر رکھی ہیں جن کی رو سے کہا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ برس اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط")۔

ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لئے ہے۔ (ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

جنسیات کی اضطراری حالتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ایک طریق بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳) وہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک، جنسی خواہش میں ضبطِ نفس ممکن نہیں۔ اسی لئے وہ کبھی جلق (MASTURBATION) کا طریق تجویز کرتے ہیں۔ کبھی عارضی نکاح کا۔ کبھی کفار کی چھوٹی چھوٹی بچیوں کو لونڈیاں بنا کر جنتیوں کے حوالے کرتے ہیں، اور کبھی جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ علم النفس کی رو سے ایسی ہیجانی کیفیت کو جنسی تنزل (SEX PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۶) ایک دلچسپ قانونی نکتہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ قرآن کریم میں زانی مرد اور زانی عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ مودودی صاحب اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

اگر مجرم مریض ہو اور اس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو یا بہت بوڑھا ہو تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینی چاہیئے تاکہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔

(تفہیم القرآن۔ جلد سوم۔ طبع اول۔ صفحہ ۳۴۱)

(۷) اور آخر میں ایک ایسی بات جس سے اسلام کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن، جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، حرفاً حرفاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ پر نازل کیا اور رسول اللہ نے اسے امت کو دیا۔ اگر اس ایمان میں ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو جائے تو مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے قرآن مجید کو ایک مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں فرمایا تھا۔ اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔ وہ کس طرح؟ اسے دل پر پتھر رکھ کر سنیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید درحقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسول اللہ نے بھی قرآن کریم کو ان سات زبانوں میں ہی پیش کیا اور امت کو سکھایا تھا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے صرف ایک زبان والے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا تاکہ امت میں اختلاف پیدا نہ ہو۔ حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا کوئی حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور نہ ہی رسول اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا۔ (ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۳۹۔ نومبر ۱۹۶۵ء صفحہ ۴۳)

اس کے بعد آپ سوچیے کہ اس قرآن مجید کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے ہم اس دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ یہ لفظاً لفظاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے رسول اللہ نے امت کو دیا تھا۔ جو کچھ مودودی صاحب نے کہا ہے وہ یکسر جھوٹ ہے۔ افترا ہے۔ اور اسلام کے خلاف ایسی سازش جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ قرآن مجید ایک زبان میں نازل ہوا اور وہی قرآن امت کے پاس محفوظ چلا آرہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ آپ اتنے ہی سے اندازہ فرما لیجئے کہ دنیا کے سامنے جب یہ اسلام پیش کیا جائے گا تو اس کے متعلق ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ آپ کو شاید علم ہوگا کہ مودودی صاحب کی تفسیر کے تعارف کیلئے انٹرکانٹی نینٹل اور میٹروپول جیسے ہوٹلوں میں تقاریب منعقد ہوئیں اور کہا جاتا ہے کہ اب اس کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ ہم اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں کہ بارگاہِ ایزدی میں التجا کریں کہ وہ اسلام کو اس قسم کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ اور آپ کی خدمت میں یہ گزارش کرونگا کہ آپ اسے چھوڑیئے کہ پرویز منکرِ حدیث ہے، منکرِ سنت ہے، ملحد ہے یا بے دین ہے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ جو کچھ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے اس کی رو سے اقامتِ دین کے یہ مدعی جنہیں "اللہ کا شاہکار" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (ایشیا ۲۵ اگست ۱۹۶۷ء) پاکستان کے خلاف کس قسم کی سازشوں میں مصروف ہیں ؎

خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں!　　　آپ اہلِ حرم کی بات کریں

آخر میں میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مودودی صاحب یا ان کی تحریک اور جماعت کی مخالفت میں میرا کوئی ذاتی مفاد مضمر نہیں۔ مجھے ہوسِ اقتدار نہیں کہ اقتدار کے پیچھے میں کبھی نہیں بھاگا۔ تقسیمِ ہند کے وقت قائداعظم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ جس مملکت کے حصول کیلئے تم نے اتنی جدوجہد کی تھی وہ اب حاصل ہو گئی ہے تم اس میں اپنے لئے جو مقام مناسب سمجھو لے لو۔ میں نے بصد احترام عرض کیا تھا کہ میری کاوشوں کا سب سے بڑا صلہ یہی ہے کہ جس مملکت کے لئے ہم نے جدوجہد کی تھی وہ حاصل ہو گئی۔ اس سے بڑا صلہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ میں دفتر کے جس میز پر یہاں (ہندوستان میں) بیٹھا ہوں، اسی پر پاکستان جا کر بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ میں اسی میز پر یہاں آ کر بیٹھ گیا اور وہیں سے میں نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ پھر کسی مذہبی فرقہ کی قیادت بھی میرے پیشِ نظر نہیں کہ میرے نزدیک مذہبی فرقہ بندی از روئے قرآن شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس شرک سے محفوظ رکھے۔ میں عملی سیاست میں بھی حصہ نہیں لیتا کہ اس میدان میں مجھے ان سے کوئی رقابت ہو۔ میں نہ پبلک سے چندے مانگتا ہوں، نہ قربانی کی کھالیں اکٹھی کرتا ہوں۔ نہ زکوٰۃ، نہ صدقات اور نہ فطرانے وصول کرتا ہوں کہ مجھے ان سے کوئی [illegible] ہو۔ میں جس طرح پاکستان کے لئے ایسا خطۂ ارض کا حصول، یہی دین کا تقاضا سمجھتا تھا، اسی طرح اس خطۂ ارض کا استحکام بھی ایمان کا تقاضا ہے کہ اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہے۔ کوئی فرد، تنظیم یا طاقت جو اس خطۂ ارض کو ضعف یا نقصان پہنچانے کے درپے ہو، علیٰ قدرِ استطاعت اس کی مدافعت اور مخالفت بھی اپنا اساسی فریضہ سمجھتا ہوں۔ مودودی صاحب کی مخالفت میں بھی میرا جذبۂ محرکہ یہی ہے۔ میں نے بہرحال مودودی صاحب کی تحریروں کے اقتباسات آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے ہیں۔ ان کے حوالے بھی دے دیئے ہیں ——— میرا یہ خطاب پمفلٹ کی شکل میں چھپ گیا ہے۔ آپ اسے لے جایئے اور اس کا بغور مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد جس نتیجہ پر بھی آپ پہنچنا چاہیں وہ آپ کا کام ہے۔ ارضِ مملکتِ پاکستان میری ذاتی ملکیت تو نہیں کہ اس کی حفاظت کی فکر تنہا مجھے ہو۔ یہ جیسی میری ہے اسی طرح آپ کی بھی مملکت ہے جس کے ساتھ آپ کی اور آپ کی آنے والی نسلوں کی، جان، مال، عزت، آبرو اور اسلام کا مستقبل وابستہ ہے۔ آپ خود فیصلہ کر لیں کہ اس باب میں آپ پر کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ اقبال نے تو خدا سے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ ؎

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا　　　مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

میں خدا سے تو نہیں لیکن آپ حضرات سے ضرور یہ کہوں گا۔ والسلام